مغربی تعلیم اور مسلمان

مسرور علی اختر ہاشمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

مغربی تعلیم اور مسلمان

مصنف و مترجم
مسرور علی اختر ہاشمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2011
تعداد	:	550
قیمت	:	-/74 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1571

Maghribi Taleem Aur Musalman

by

Masroor Ali Akhtar Hashmi

ISBN :978-81-7587-747-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی-6

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho(Top) کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے خفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

	اظہار تشکر	ix
	تعارف	xi
باب اول	برطانوی دور میں تعلیم کی نشو ونما	1
باب دوم	دارالعلوم دیوبند	43
باب سوم	ایم، اے، او، کالج، علی گڑھ	85
باب چہارم	دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ	135
باب پنجم	جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	171
	نتائج	221
	کتابیات	231

اظہارِ تشکر

میں پروفیسر ایس، شکلا سابق صدر شعبۂ تعلیم، دہلی یونیورسٹی اور پروفیسر ضیاالحسن فاروقی، سابق ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اس مقالے کو سنوارنے کے لیے نہایت مفید مشورے دیے۔

میں ڈاکٹر سلامت اللہ، سابق پرنسپل، ٹیچرس کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے پرانے علی گڑھ اور جامعہ کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔

آخر میں جناب شہاب الدین انصاری، سابق لائبریرین، ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اس مقالے کے لیے مواد تلاش کرنے میں میری بڑی مدد کی۔

تعارف

تعارف

پندرھویں صدی کی آخری دہائی میں پرتگالی ہندوستان میں آئے اور پھر یورپین قوموں کے لیے ہندوستان کا دروازہ کھل گیا۔ ولندیزی آئے، فرانسیسی آئے، برطانوی آئے۔ انھوں نے ساحلی شہروں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں بنالیں۔ ان ہی کے پیچھے مشنری آئے اور تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کیا۔ اپنے کارکنوں کے بچوں کے لیے اسکول کھولے، مقامی آبادی کے بچے بھی ان اسکولوں میں گئے۔ کہیں کہیں یورپی زبانوں اور مقامی زبانوں کے اتصال سے نئی زبانیں بھی بننا شروع ہوئیں جو بچپن ہی میں فوت ہوگئیں۔ دیسی زبانوں میں کتابیں چھاپنے کا کام بھی ہوا۔ کچھ یورپین قومیں مقامی سیاست میں الجھ گئیں، اور پھر آپس میں لڑنے لگیں۔ یورپی جنگوں کے سائے ہندوستان کی مقامی جنگوں پر گہرے ہونے لگے۔ مقامی قوتیں کمزور ہوتی گئیں، فرانسیسی یورپ میں ہارے اور ہندوستان میں بھی نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی ہندوستان کی سیاست پر چھا گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجارت سے سیاست کا سفر 1858 میں تمام ہوا اور ہندوستان تاجِ برطانیہ کے تحت آ گیا۔

1857 کے غدر کے بعد مسلمانوں کے رویے بدل گئے۔ مغربی تعلیم اور تہذیب کے چیلنج کو انھوں نے قبول کیا۔ ردِعمل کے طور پر دیوبند قائم ہوا، علی گڑھ وجود میں آیا۔ دونوں بظاہر ایک دوسرے کی ضد تھے۔ لیکن دونوں کا دعویٰ تھا کہ مسلمانوں کی کردار سازی ان کا نصب العین تھا۔ ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ اسلامیہ بدلے ہوئے سیاسی ماحول میں قائم ہوئے۔ نصب العین ان کا بھی مختلف نہیں تھا۔ انھوں نے علی گڑھ اور دیوبند سے اثر لیا، لیکن مغربی تعلیم و تہذیب کے چیلنج کا اپنے طور سے جواب دیا۔ یہ چاروں ادارے جدید ہندوستان میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک تعلیم یافتہ مسلمان کو کیا ہونا چاہیے۔ اس تحقیقی مقالے میں کوشش یہی سمجھنے کی گئی ہے کہ اداروں کے قیام کے پیچھے کیا خیالات کارفرما تھے اور ان کی نشوونما کس طرح ہوئی۔

ان چاروں اداروں کی تحقیق چار عنوانات کے تحت کی گئی ہے۔ اغراض و مقاصد، تاریخ، نصابِ تعلیم اور خصوصیات۔ اس کے علاوہ ایک باب اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے سماجی اور سیاسی حالات نیز اس دور میں تعلیم کی نشوونما کے بارے میں ہے، کیونکہ جس دور کے بارے میں یہ مقالہ لکھا گیا ہے اس کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے سیاسی، سماجی اور تعلیمی نشوونما کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔

اداروں کے بانیان کے خیالات کے بارے میں جاننا اس لیے ضروری ہے کہ انھیں جانے بغیر ادارے کے اغراض و مقاصد کا صحیح ادراک مشکل ہوتا۔ اداروں کی نشوونما کی تاریخ جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر ان مسائل کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا جو اداروں کو قائم کرنے اور انھیں چلانے میں بانیوں اور کارکنوں کو پیش آئے۔ نصاباتِ تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اغراض و مقاصد کی تکمیل کس طرح کی گئی۔ خصوصیات کا مطالعہ اس لیے ضروری سمجھا گیا تاکہ قول اور عمل اور خیال اور اظہار کے تفاوت کا اندازہ صحیح طور سے کیا جا سکے۔

اس تحقیقی مقالے کے لیے تحریک ذہنی بعض ان کتابوں سے ملی جو مسلمانوں کی تعلیم

وثقافت اوران کے عمل کے دوسرے میدانوں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں جیسے شیخ محمد اکرام کی موج کوثر اور ڈاکٹر عزیز احمد کی Modernism in India and Pakistan (1857-1964)۔

میرا یہ تحقیقی مقالہ 1989 میں کتابی شکل میں 'Muslim Response to Western Education' کے عنوان سے چھپ گیا تھا۔ ملک کے اندر اور باہر واقعتاً اس کی کتنی پذیرائی ہوئی اس کا تو مجھے علم نہیں۔ لیکن یہ معلوم ہو کر کہ اس کی کاپیاں لائبریری آف کانگریس واشنگٹن، یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلے، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی کوالالمپور ملیشیا میں ہیں مجھے واقعی خوشی ہوئی۔ پھر امیزن ڈاٹ کام، بورڈرز وغیرہ کی ویب سائٹ پر بھی اس کا اشتہار دیکھا۔ لیکن سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علموں نے اسے پڑھنے میں دلچسپی دکھائی۔ ان کی دلچسپی اور دوستوں کے اصرار پر میں نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ اگر یہ ترجمہ اردو داں حضرات وخواتین، خصوصاً طلبا کو پسند آیا اور ان کے مفید مطلب ہوا تو سمجھوں گا کہ محنت کا صلہ مل گیا۔

باب اوّل

برطانوی دور میں تعلیم کی نشوونما

وارن ہیسٹنگز ایسٹ انڈیا کمپنی کا آخری گورنر تھا۔ اسی کے زمانے سے برطانوی پارلیمان کمپنی کے معاملات پر نظر رکھنے لگی تھی۔ اس نے 1781 میں کلکتہ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ وہ عام انگریزوں سے مختلف تھا۔ ایک مورخ نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ مشرقی نظریات کا حامل، ہندوستانی علم وادب کا شائق، ہندوستان کی کئی زبانیں روانی سے بولنے پر قادر، بہت سے ہندوستانیوں کا دوست، اس اصول کا قائل کہ ہندوستانیوں پر ان ہی کے طریقوں سے حکومت کی جائے اور کمپنی کی حیثیت ایک اعلیٰ ثالث اور انصاف کی آخری عدالت رہنی چاہیے''[1]۔ اس لیے یہ تعجب کی بات نہیں کہ ''مدرسے کے بانی کی نیت یہی تھی کہ عربی وفارسی زبانوں کے مطالعے پر اور خاص طور سے فقہۂ اسلامی کے مطالعے پر زور دینا چاہیے تاکہ انصاف کی عدالتوں کو قابل عہدے دار مل سکیں''[2]۔ مدرسہ میں ذیل کے مضمون پڑھائے جاتے تھے: طبعی فلسفہ، دینیات، قانون، نجوم، اقلیدس، ریاضی، منطق، فن خطابت، فن تقریر، اور قواعد۔

کلکتہ مدرسہ کے قیام کے دس برس بعد برطانوی ریذیڈینٹ جوناتھن ڈنکن نے بنارس

میں ہندو سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد ہندوؤں کے مقدس شہر میں ان کے قانون، ادب اور مذہب (خصوصاً قانون) کی آبیاری اور تحفظ کرنا تھا۔ خیال تھا کہ اس کے قیام سے دونوں کو فائدہ ہوگا، مقامی باشندوں کو تعلیم کے سبب اور برطانوی سرکار کو توقیر میں اضافے کے سبب[3]۔ سنسکرت کالج میں یہ مضامین پڑھائے جاتے تھے: دھرم اور مذہبی رسومات، آیورویداور نباتات، موسیقی، مکانکس، فنون، قواعد، ریاضی، منطق، مابعد الطبیعات، قانون، تاریخ، اخلاقیات، فلسفہ اور شاعری۔

یہ دونوں ادارے جن مقاصد کے تحت قائم کیے گئے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی حکمراں 'ہندو اور مسلمان' دونوں سے یہ چاہتے تھے کہ وہ عدالتوں کے انتظام کو بہتر بنانے میں ان کی مدد کریں۔ دونوں اداروں میں پڑھائے جانے والے مضامین سے یہ بات بھی پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ہندوستانیوں کو ان کے ثقافتی ورثے کا علم ان ہی کی کلاسیکی زبانوں، فارسی، عربی، سنسکرت کے ذریعہ دیا جاتا تھا۔ برطانوی انتظامیہ کے عہدیداروں نے ابھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ہندوستانی لوگ انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی علوم حاصل کریں۔

1813 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا چارٹر جب تجدید کے لیے برطانوی پارلیمان کے سامنے آیا، تو ایک لاکھ روپے کی رقم 'ہندوستان کے عالموں کی ہمت افزائی' ان کے علم وادب کی ترقی اور تجدید کے لیے، اور ہندوستان کی برطانوی حدود میں رہنے والے باشندوں میں سائنس کو متعارف کرانے اور انھیں ترقی دینے کے لیے رکھی گئی[4]۔ یہ مقننہ کی پہلی امداد تھی جو برطانوی پارلیمان نے تعلیم کے سلسلے میں کمپنی کو دی۔

وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں تعلیم کے سلسلے میں جو مساوی سلوک کیا جاتا تھا لگتا ہے اب اس کا جھکاؤ سنسکرت کے علوم کی طرف ہوگیا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس اس رقم کو صرف سنسکرت علوم کی ترقی پر خرچ کرنا چاہتا تھا[5]۔ یہ جھکاؤ کچھ تو وقتی مصلحتوں کی بنا پر تھا اور کچھ اس بنا پر بھی کہ بنگال

کے ہندوؤں نے مغربی تعلیم کو فوراً اپنا لیا تھا۔

اسی زمانے میں مارش مین اور وارڈ، جو بپتسمہ دینے والے عیسائی فرقے کے پادری تھے6، سیرامپور کی ڈچ کالونی میں آ بسے۔ انھوں نے اور کیری نے، جو چھ برس پہلے ہی یہاں آ گئے تھے، کلکتہ کے مضافات میں تقریباً 20 اسکول کھول دیے۔ کام کے ابتدائی زمانے میں انھوں نے دیسی زبان میں کچھ کتابیں چھپوائیں، جن کا مواد قابلِ اعتراض تھا۔ ان سے ہندو اور مسلمان دونوں کو ٹھیس پہنچی۔ چنانچہ سرکار نے انھیں متنبہ کیا کہ ایسی سرگرمیوں سے باز رہیں جن سے مقامی باشندوں کے جذبات مجروح ہوں۔ اس تنبیہ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ پھر بھی پادری صاحبان کتابیں بھی چھاپتے رہے اور اسکول بھی کھولتے رہے۔

یہ کوئی راز کی بات نہیں تھی کہ پادریوں کا اصل مقصد تبدیلیٔ مذہب تھا خواہ سرگرمیوں کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عیسائی مذہب قبول کر کے ہندوستانی اپنی عمومی اور اخلاقی حالت بہتر کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کر دی ہو، ان کا یہ رویہ کچھ عجب بھی نہ تھا۔

سرکار بہرحال بڑی محتاط تھی اور پادریوں کی ایسی سرگرمیوں پر برابر نظر رکھتی تھی جن کی بنا پر مقامی لوگ مخالف ہو جائیں۔ لیکن ان کی سرگرمیوں کو عام طور پر اور تعلیم کے میدان میں خاص طور سے، ان کے کاموں کو تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو خود گورنر جنرل نے بھی ان کی ہمت افزائی کی۔ مثال کے طور پر گورنر جنرل لارڈ موئرا نے 1815 میں سیرامپور کی کالونی کا دورہ کیا۔

1813 کی مراسلت میں ایک لاکھ روپے کی جو رقم منظور کی گئی تھی وہ بہت مدت تک استعمال نہ کی جا سکی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکار نیپال کی جنگوں میں اور مرکزی ہندوستان میں امن بحال کرنے میں مصروف تھی۔

اسی دوران ڈیوڈ ہیئر 7 اور راجہ رام موہن رائے 8 نے کلکتہ میں ودیالیہ کے نام سے ایک انگریزی اسکول کھولا۔ ودیالیہ مشن اسکولوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشہور و مقبول ہو گیا۔ اسی طرح کا ایک اسکول جوئے نرائن گھوسال نے 1818 میں بنارس میں کھولا۔ یہ اسکول کلکتہ کے اسکول کے صرف ایک برس بعد کھولا گیا تھا۔ یہ اسکول زیادہ تر ہندوؤں کے چندے سے قائم کیے گئے تھے۔ اور یہ بات کہ ہندوؤں نے مغربی علوم اور انگریزی زبان کے چیلنج کو انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہی قبول کر لیا تھا، صرف ان اسکولوں کے قیام سے ہی نہیں ثابت ہوتی ہے بلکہ اس پُر زور احتجاج سے بھی ثابت ہوتی ہے جو راجہ رام موہن رائے نے 1823 میں انگریزی تعلیم کے بجائے سنسکرت کی تعلیم پر خرچ کرنے کے خلاف کیا تھا9۔

کلکتہ اسکول بک سوسائٹی 1817 میں قائم ہوئی۔ دیسی اسکول بک سوسائٹی 1823 میں بمبئی میں قائم ہوئی۔ ان سوسائٹیوں کے قیام کا پہلا مقصد اسکولوں کے لیے دیسی کتابیں چھاپنا تو تھا ہی، نئے اسکول کھولنا بھی تھا۔ ان سوسائٹیوں نے بڑی احتیاط برتی تا کہ مقامی لوگوں کے جذبات برانگیختہ نہ ہوں جیسے کہ پادریوں کی مطبوعہ کتابوں سے ہوئے تھے۔

تعلیم کی نشو و نما میں ایک اہم سنگ میل کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں پبلک انسٹرکشن کمیٹیوں کا قیام ہے۔ کلکتہ کی پبلک انسٹرکشن کمیٹی 1823 میں قائم ہوئی۔ مدراس کی پبلک انسٹرکشن کمیٹی 1826 میں قائم ہوئی۔ بمبئی میں ایجوکیشن سوسائٹی 1823 میں قائم ہوئی۔ یہ بھی اسی طرح کی تنظیم تھی جیسی کلکتہ اور مدراس کی پبلک انسٹرکشن کمیٹیاں۔ پبلک انسٹرکشن کمیٹیوں کا خاص کام کمپنی کی حدود میں تعلیم کی حالت کا جائزہ لینا تھا، اور پھر سرکار کو وہ اقدامات تجویز کرنا تھا جن کی مدد سے ہندوستان کے مقامی باشندوں کی تعلیم کو بہتر بنایا جا سکے۔

کلکتہ کی پبلک انسٹرکشن کمیٹی کے ممبران واضح طور پر دو برابر کے حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف وہ ممبر تھے جو مشرقی علوم کے حق میں تھے، دوسری طرف وہ ممبر تھے جو مغربی تعلیم

کے حق میں تھے۔ چنانچہ 1835 تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ ہندوستانی لوگ کس طرح کی تعلیم حاصل کریں۔ لارڈ میکالے کلکتہ کی پبلک انسٹرکشن کمیٹی کے صدر اور سپریم کاؤنسل کے ایک اہم ممبر تھے جو حال ہی میں قائم کی گئی تھی۔ انھوں نے 2 فروری 1835 کو مغربی تعلیم اور انگریزی زبان کے حق میں اپنی مشہور تجویز پیش کی۔ ولیم بینٹنک جو گورنر جنرل ان کاؤنسل تھے میکالے کی دلیلوں سے پوری طرح متفق تھے۔ انھوں نے 7 مارچ 1835 کو انگریزی تعلیم کے حق میں پیش کی جانے والی قرارداد منظور کر لی، اور ہندستانیوں کو دی جانے والی تعلیم کی نوعیت کے بارے میں جو بحث چل رہی تھی اس کا حتمی فیصلہ کر دیا۔

اس قرارداد کی رو سے مشرقی علوم کے کالج تو اپنا کام جاری رکھ سکتے تھے، لیکن مشرقی علوم کی کتابیں چھاپنے اور ان علوم کے طالب علموں کو دی جانے والی رقم آئندہ کے لیے روک دی گئی۔10

مغربی علم اور انگریزی زبان کے حق میں دیا جانے والا یہ نہایت اہم فیصلہ بنگال کے ہندوؤں نے پسند کیا، کیونکہ وہ پہلے ہی اس کے حق میں تھے 11۔ مغربی تعلیم اور انگریزی زبان ان میں خاصی مقبول ہو چکی تھی۔ اس مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنوری 1834 اور دسمبر 1835 کے دوران اسکول بک سوسائٹی نے جو انگریزی کتابیں چھاپیں اور بیچیں ان کی تعداد سوسائٹی کی آٹھ دیسی زبانوں میں چھاپی جانے والی کل کتابوں کی تعداد سے دس ہزار زیادہ تھی 12۔

7 مارچ 1835 کی قرارداد کے بارے میں کلکتہ کے مسلمانوں کے جذبات ہندوؤں سے بالکل مختلف تھے۔ کلکتہ کے کوئی آٹھ سو مولویوں اور مقتدر لوگوں نے دستخط کر کے ایک درخواست دی جس میں اس قرارداد پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا، اور جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ صرف مغربی تعلیم اور انگریزی زبان کی ہمت افزائی کرنے کا مقصد ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا

تھا13۔

انگریزی تعلیم کے مقاصد، نصاب اور طریقۂ تدریس کے بارے میں مسلمانوں کے شبہات مغربی تعلیم کے چیلنج کو قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ایسا بھی نہیں تھا کہ ان کا خوف بالکل ہی بے بنیاد ہو۔سرکار کے بڑے بڑے عہدیدار جس طرح سے پادریوں کی ہمت افزائی کرتے تھے اسے لوگ دیکھتے اور محسوس کرتے تھے۔ 1815 میں گورنر جنرل لارڈ موئرا کا دورۂ سیرامپور، اور مدراس کی سرکاری درسگاہوں میں انجیل کو نصاب تعلیم میں شامل کرنے پر گورنر مدراس، مارکوئس ٹوئی ڈل کی رضامندی، اتنی نمایاں چیزیں تھیں کہ عوام کی نظروں سے بچ نہیں سکتی تھیں۔یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سرکاری درس گاہوں میں انجیل کی تعلیم کے حق میں مارکوئس ٹوئی ڈل کی تجویز کو بالآخر کورٹ آف ڈائرکٹرس نے نامنظور کر دیا تھا۔لیکن کورٹ آف ڈائرکٹرس کی ہدایات کے باوجود مدراس سرکار نے وہاں کے شہریوں کو شکایت کا موقع دیا، اور انھوں نے 10 دسمبر 1852 کو برطانوی پارلیمان سے یہ احتجاج کیا کہ تعلیم میں مذہبی دخل اندازی کی جارہی ہے14۔

انگریزی تعلیم کے حق میں بینٹنک کی 1835 کی قرارداد مشرقی علوم کے کالجوں میں پڑھنے والے طلبا کو مالی امداد دیے جانے کے خلاف تھی، اور اس بات کے حق میں تھی کہ مشرقی علوم کے مسلم ادارے اور سنسکرت کالج بالآخر بند ہو جائیں۔مستشرقین نے مشرقی علوم کے خلاف کی جانے والی اس کارروائی کی مخالفت کی۔لارڈ آکلینڈ نے 1839 میں اس تنازع کو حل کر دیا، اور ولیم بینٹنک کی قرارداد کی اس مد کو خارج کر دیا۔

لارڈ ہارڈرنگ نے 1844 میں یہ طے کر کے انگریزی تعلیم پر مزید زور دیا اور بالواسطہ طور پر اس کے حصول کے لیے لوگوں کی ہمت افزائی کی کہ جو لائق طلبا اُن اداروں سے فارغ ہوں گے جہاں مغربی علوم کی تعلیم انگریزی زبان میں دی جاتی ہے، انھیں سرکاری ملازمتوں میں ترجیح دی

جائے گی۔ اس طرح ان اعلیٰ مقاصد میں ایک نہایت مادّی مقصد اور شامل کر دیا گیا جن اعلیٰ مقاصد کا تعلق مغربی علوم اور سائنس کی نئی روشنی سے قائم کیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں میں انگریزی تعلیم کو مقبول بنانے کی سمت میں یہ بہر حال ایک بڑی پیش رفت تھی۔

لارڈ ہارڈنگ کی 1844 کی تعلیمی قرارداد میں اس بات پر بھی زور دیا گیا تھا کہ سرکاری کارروائی میں فارسی کے بجائے انگریزی زبان استعمال کی جائے۔ گو یہ فیصلہ بنگال کی سرکار نے 26 جون 1829 کو ہی کر لیا تھا، لیکن اس پر عمل صرف ریاستوں کے نوابوں، راجاؤں اور شہزادوں سے خط و کتابت کے معاملے ہی میں کیا جاتا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ کی اس قرارداد کا نفاذ مختلف ذرائع سے ہوتا تھا، جن میں سب سے اہم ذریعہ کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن تھی۔ اس نے لوگوں کا امتحان لینے کے لیے کچھ ضابطے وضع کیے تھے جن کو پورا کرنے پر لیاقت کا سرٹیفکٹ ملتا۔ اس سرٹیفکٹ سے سرکاری ملازمت ملتی۔

یہ امتحان ان مضامین میں لیا جاتا جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ چونکہ یہ مضامین مذہبی نہیں تھے اس لیے مشن اسکولوں میں پڑھائے جانے والے مذہبی مضامین سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے غیر ضروری ہو گئے۔ اس سے مشنریوں میں تو بے اطمینانی بڑھ گئی، لیکن سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی وقعت میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جانے والا موادِ تعلیم مکمل طور پر سیکولر نہیں تھا۔ اس میں ایسی بہت سی باتیں تھیں جن کی بنیاد مذہب پر تھی[15]۔

تعلیم کے بارے میں اس وقت تک کی سب سے اہم دستاویز کورٹ آف ڈائرکٹرس کی 9 جولائی 1853 کی تعلیمی مراسلت تھی، جس کو عام طور سے وودس ڈسپیچ کہا جاتا ہے۔ یہ نام سر چارلس وود کے نام پر پڑا تھا، جو بعد میں لارڈ ہیلی فیکس کہلائے، اور جو بورڈ آف کنٹرول کے چیئرمین تھے۔ ان ہی کے کہنے پر یہ مراسلت تحریر کی گئی تھی۔ یہ بڑی جامع دستاویز تھی۔ اس میں

تعلیم کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں تجاویز دی گئی تھیں۔ اس کا مقصد تعلیم کی ترقی تھا اور اس کے دائرۂ عمل کو انگریزی اور دیسی دونوں طرح کے اداروں کے ذریعے پھیلانا تھا۔ اس کام کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئی تھیں:

1۔ تعلیم کے انتظام کے لیے علاحدہ شعبے قائم کیے جائیں۔

2۔ صدر مقامات پر یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔

3۔ اسکول کی ساری جماعتوں میں پڑھانے کے لیے تربیتِ اساتذہ کے ادارے قائم کیے جائیں۔

4۔ سرکار کے موجودہ ہائی اسکولوں اور کالجوں کو قائم رکھا جائے، اور جہاں ضرورت ہو ان کی تعداد بڑھائی جائے۔

5۔ نئے مڈل اسکول قائم کئے جائیں۔

6۔ ورنا کیولر، دیسی اور دوسرے ابتدائی اسکولوں پر زیادہ توجہ دی جائے۔

7۔ سرکاری امداد کا نیا نظام جاری کیا جائے16۔

حالانکہ ڈسپیچ نے عام لوگوں کی تعلیم کی ذمہ داری براہِ راست حکومت پر نہیں ڈالی، لیکن یہ ضرور کہا کہ سرکار کی ذمہ داریوں میں کسی نہ کسی وقت اس ذمہ داری کو بھی شامل کر لیا جائے۔ ڈسپیچ سے پہلے تعلیم کے بارے میں سرکار کی کوششوں میں کوئی اصول نہیں تھا۔ ڈسپیچ نے ایک نظام بنانے کی تجویز سامنے رکھی اور تعلیم کا شعبہ قائم کرنے کے لئے کہا تا کہ سرکار کی کوششیں برابر جاری رہ سکیں۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر ذریعہ تعلیم عام طور پر انگریزی رہے گا، اور اسکول کی سطح پر دیسی زبان۔

ڈسپیچ کے مطابق یونیورسٹیاں صدر مقامات پر قائم ہونی تھیں۔ چنانچہ جنوری، جولائی اور ستمبر 1857 میں جب ہندوستان غدر کی زد میں تھا، بالترتیب کلکتہ، ممبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرکار اعلیٰ تعلیم کے بارے میں کس حد تک سنجیدہ

تھی۔

تنقید کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو جہاں ڈسپیچ نے ذریعۂ تعلیم کے تنازع کو حل کر دیا، وہیں تعلیم کی بابت سرکار کی حکمت عملی کو ایک واضح سمت بھی دے دی۔ تعلیم کے بارے میں سرکار کی بے اعتنائی اور بے اصولا پن ختم ہو گئے۔ اب تعلیمی صورت حال کو اچھی طرح سمجھ کر سرکاری امداد کے ذریعے اسے بہتر بنانے کی کوشش کی جانے لگی۔ اس نظام کے پیچھے یہ خیال کارفرما تھا کہ تعلیم ایک نجی مہم ہونی چاہیے جو سرکاری امداد کے ذریعے آگے بڑھے، اور جہاں بھی ضرورت ہو یہ سرکاری امداد تعلیمی اداروں کو چلانے اور نئے ادارے قائم کرنے کے لئے دی جائے۔ یہ درست ہے کہ شروع میں سرکاری امداد کا فائدہ مشن اسکولوں کو پہنچا کیونکہ ان دنوں مشن اسکول ہی پرائیویٹ اسکولوں کے اس زمرے میں آتے تھے جو سرکاری امداد حاصل کر سکتے تھے 17۔

سرکاری امداد حاصل کرنے کے لئے تعلیم کا سیکولر ہونا ضروری شرط تھی۔ جن افسران پر سرکاری امداد دینے کی ذمہ داری ہوتی ان کے ذہن میں سیکولر تعلیم کے اصول کو اچھی طرح بٹھانے میں بڑا وقت لگتا۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ 1857 میں تین یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیوں کے قیام سے پنجاب کے شرفا اور زمینداروں کو تحریک ہوئی، اور انھوں نے مانگ کی کہ ان کے صوبے میں بھی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ 1869 میں لاہور یونیورسٹی کالج کا قیام عمل میں آیا، جو ترقی کر کے بالآخر 1882 میں پنجاب یونیورسٹی بن گیا۔ جن مقاصد کے تحت لاہور یونیورسٹی کالج قائم کیا گیا وہ لائق توجہ ہیں:

1۔ جہاں تک ممکن ہو یورپی سائنس کی ترقی و ترویج پنجاب کی دیسی زبانوں کے ذریعے کی جائے، اور خود دیسی ادب کی ترقی اور اشاعت کی جائے۔

2۔ مشرقی کلاسیکی زبانوں اور ان کے ادب کے مطالعے کی ہمت افزائی کی جائے۔

3۔ پسندیدہ تعلیم کوفروغ دینے اوراس کی نگرانی کرنے میں صوبے کے تعلیم یافتہ اور بااثر طبقات کوسرکاری افسران کے ساتھ شریک کیا جائے۔

یہ بات بھی کہی گئی کہ انگریزی زبان اورادب کے مطالعے کی ہمت افزائی کی جائے، اور جومضامین مکمل طور پر دیسی زبان میں نہ پڑھائے جاسکیں ان کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہواور امتحان بھی انگریزی میں لیا جائے18۔

یہ بات قابل غور ہے کہ کالج کے مقاصد میں اس پر زور دیا گیا کہ اعلیٰ تعلیم میں ذریعۂ تعلیم دیسی زبان ہونی چاہیے۔

1887 میں جب الٰہ آباد یونیورسٹی تشکیل دی گئی تو یونیورسٹیوں کی کل تعداد پانچ ہوگئی۔ برطانوی ہندوستان میں کل پانچ یونیورسٹیوں کی موجودگی سے اعلیٰ تعلیم کے پھیلاؤ کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ یہ ساری یونیورسٹیاں الحاقی تھیں، اور بہت سے کالجوں نے ان سے الحاق کرلیا تھا۔ اس لئے اعلیٰ تعلیم کے پھیلاؤ کو دیکھنا ہوتو اس زمانے کے کالجوں کی تعداد دیکھنا چاہیے۔ 1882 میں بہتر (72) کالج تھے جب کہ 1857 میں صرف ستائیس (27) کالج تھے19۔

ہندوستانی سرکار نے 1882 میں انڈین ایجوکیشن کمیشن مقرر کیا تا کہ ''خاص طور سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ 1854 کی مراسلت کے اصولوں پر کس طرح عمل کیا گیا ہے، اور وہ تجاویز پیش کی جائیں جن کے ذریعے مراسلت کی حکمت عملی کو مزید بڑھاوا دیا جاسکے''20۔ کمیشن کے صدر ڈبلیو ہنٹر تھے، اسی لئے اسے ہنٹر کمیشن بھی کہا جاتا ہے۔

1854 کی مراسلت کا ایک اصول گرانٹ اِن ایڈ (سرکاری مالی امداد) کا نظام قائم کرنا تھا۔ مراسلت نے جو تعلیمی حکمت عملی وضع کی تھی یہ نظام اس کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ سرکار بھی اس حکمت عملی سے پورے طور پر متفق تھی۔ گرانٹ اِن ایڈ کا یہ نظام انگلستان میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مزید برآں، سرکار اپنے محدود وسائل کی بنا پر برطانوی ہندوستان کی اتنی بڑی آبادی کے

لیے تعلیم کی ساری ذمہ داری لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ہندوستان کے لوگوں کا مذہبی کردار بھی گرانٹ اِن ایڈ نظام کے حق میں تھا۔ تعلیم کی نوعیت کے بارے میں سرکار کے خلاف پیدا ہونے والی غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے بھی یہ طریقہ اچھا تھا کہ تعلیمی اداروں کی تنظیم اور انتظام مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیے جائیں۔

یہ سوچا گیا کہ گرانٹ اِن ایڈ نظام کے تحت تعلیمی اداروں کے اخراجات بڑی حد تک تو فلاحی تنظیمیں اور فیاض افراد پورے کریں گے، اور ان کے قائم کرنے اور چلانے کے بقیہ اخراجات سرکاری امداد سے پورے کیے جائیں گے۔ جہاں نجی سرمایہ کاری کی کمی ہوتی اور اداروں کی ضرورت محسوس کی جاتی وہاں سرکار خود بھی ادارے قائم کرتی اور چلاتی، لیکن عام حکمتِ عملی یہی تھی کہ جہاں بھی افراد اور تنظیمیں یہ ذمہ داری لینے کو تیار ہوں وہاں سرکار پیچھے ہٹ جائے۔ سرکاری امداد جن اداروں کو دی جاتی وہ سرکار کے اختیار میں رہتے۔ سرکاری افسران ان کے معائنے کرتے اور نصاب، نظم وضبط، کارکنان کی تنخواہوں وغیرہ کے بارے میں اداروں کو سرکار کے اصول وضوابط کی پابندی کرنی پڑتی۔

اعلیٰ تعلیم کے بارے میں انڈین ایجوکیشن کمیشن کا کہنا تھا کہ ''گرانٹ اِن ایڈ نظام قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے سرکاری نظام کو وسعت دے اور جہاں ضرورت ہو وہاں جزوی طور پر اس کی جگہ لے لے'' 21۔ اس صورتِ حال سے یا تو مشنری فائدہ اٹھا سکتے تھے یا پھر ہندوستانی۔ ہندوستانیوں نے اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں 1882 تک کوئی معقول پیش رفت نہیں کی، مشنریوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ 1882 کے بعد صورتِ حال بدل گئی اور نجی ہندوستانی کوششیں زیادہ بڑھ گئیں۔ 1902-1901 میں ہندوستانیوں کے زیرِ انتظام کالجوں کی تعداد بیالیس (42) تھی جب کہ مشنریوں کے کالج سینتیس (37) تھے 22۔

تعلیمی اداروں کی تنظیم اور انتظام میں ہندوستانیوں کے بڑھتے ہوئے شوق کا سبب قومی

جذبات کی بیداری تھی، کیوں کہ انھیں جذبات کی آبیاری کے لیے 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس بنائی گئی تھی۔ لیکن یہ بات جزوی طور پر ہی صحیح ہے۔ ایک دوسرا سبب اور بھی تھا۔ ہندوستانیوں پر اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ برطانوی لوگ غیر معینہ مدت تک ہندوستان میں رہیں گے۔ اس لئے انگریزی زبان اور مغربی تعلیم حاصل کرنا مختلف وجوہات کی بنا پر ضروری ہو چکا ہے، خاص طور پر حصولِ روزگار کے لیے 23۔ اس وقت تک یونیورسٹی کی ڈگری سرکاری ملازمت کے لئے پروانۂ راہداری بن چکی تھی۔

عہدِ وکٹوریہ (1854-1902) کے دوسرے نصف میں کالجوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا، اور تعلیم کا معیار نیچا ہو گیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے تعلیمی معیار کی اس کمی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ''انھوں نے (انڈین ایجوکیشن کمیشن نے) جو (تعلیمی) حکمتِ عملی وضع کی اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ تعلیم (تیزی سے) پھیلے، گہرائی پیدا ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ اگلے بیس (20) برسوں میں جو کالج بنے وہ کمزور تھے، ان میں اساتذہ اور کارکنان کم تھے، طلبا پر انفرادی توجہ نہیں دی جا سکتی تھی، نصابات، عملی ہوں یا ادبی، ان میں مختلف نوعیت کے مضامین نہیں تھے۔ یہی سب باتیں بنگال (میں تعلیم) کی صحت مند نشوونما کے لیے ضروری تھیں'' 24۔

عہدِ وکٹوریہ میں اعلیٰ تعلیم کی دوسری کمی یہ تھی کہ جدید ہندوستانی زبانوں کو یونیورسٹی کی سطح پر نظر انداز کر دیا گیا۔ 1854 کی مراسلت میں صاف طور سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ یونیورسٹیوں میں جدید ہندوستانی زبانوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ لیکن سوائے مدراس یونیورسٹی کے جہاں طلبا کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ مطالعے کے لیے کسی ایک جدید ہندوستانی زبان کا انتخاب کر سکتے تھے، دوسری یونیورسٹیوں میں جدید ہندوستانی زبانوں کو یا تو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا تھا یا پھر نصاب میں ان کو نیچی حیثیت دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن زبانوں کو یونیورسٹی کی سطح پر ذریعۂ تعلیم کا درجہ مل جانا چاہیے تھا ان کو یہ درجہ مدت تک نہ مل سکا۔ جدید ہندوستانی زبانوں سے غفلت برتنے

کی وجہ سے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے اور عام ہندوستانیوں کے درمیان خلیج گہری ہوتی چلی گئی۔

اعلیٰ تعلیم کی نشو ونما میں ایک اور اہم سنگ میل 1902 میں انڈین یونیورسٹیز کمیشن کا قیام تھا۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تنظیم اور طریقۂ کار بہت کچھ اسی کمیشن کی سفارشات پر مبنی ہے۔ اس کمیشن کی سفارشات 1904 کے انڈین یونیورسٹیز ایکٹ میں شامل کی گئی ہیں۔ اس ایکٹ نے یونیورسٹیوں کے دائرۂ کار کو کافی وسعت دی۔ یونیورسٹیوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ پروفیسروں اور لیکچررروں کا تقرر کرے، تعلیمی اوقاف حاصل کرے اور ان کا انتظام کرے، طلبا کے طرزِ عمل کے بارے میں ضوابط تیار کرے۔ ایکٹ کی رو سے یونیورسٹی سینیٹ کے فیلوز کی تعداد ایک وقت میں پچاس (50) سے کم اور سو (100) سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے، جن میں پندرہ (15) سے بیس (20) تک انتخاب کے ذریعے اور باقی سرکار کے نامزد کیے ہوئے ہونے چاہیے، اور ان کی مدتِ کار پانچ (5) برس ہونی چاہیے۔ ایکٹ کی رو سے یونیورسٹی سنڈیکیٹ میں اساتذہ کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ سنڈیکیٹ کی حیثیت قانونی تھی۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ وقتاً فوقتاً ان کالجوں کا معائنہ کرتی رہے جن کا الحاق یونیورسٹی سے ہوتا کہ کالجوں کی کارکردگی کا معیار بہتر رہے۔ یونیورسٹی سے کالج کا الحاق باقی رہے یا نہ رہے اس کی اجازت سرکار دیتی تھی۔ یونیورسٹی سینیٹ جو ضابطے بناتی تھی انھیں بھی سرکار ہی منظور کرتی تھی25۔

1904 کے ایکٹ کے بارے میں ہندوستانیوں کے ذہن میں بعض شبہات تھے۔ ایک عام خیال یہ تھا کہ سرکار یورپین پروفیسروں کے ہاتھوں میں طاقت دے رہی ہے تاکہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہندوستانی کوششوں کو بے اثر بنا دیا جائے۔ لیکن یہ خطرات بڑھا چڑھا کر بیان کیے جا رہے تھے۔ 1904 کا ایکٹ اعلیٰ تعلیم کی ساری خرابیوں کو دور نہ کر سکا، حالانکہ سرکاری حلقوں میں یہی پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا۔ یونیورسٹیوں کا انتظام ضرور بہتر ہو گیا۔ اختیارات بڑھے تو یونیورسٹیوں کے مالی اخراجات بھی بڑھ گئے۔ ان اضافی اخراجات کی منظوری سرکار نے

1904-1905 میں دے دی گئی۔ لارڈ کرزن کی سرکار کے زمانے میں شروع ہونے والی یہ اضافی امداد ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کا مستقل جز بن گئی۔

اس جگہ یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ کرزن نے آرٹ کی تعلیم، زراعت کی تعلیم، اخلاق کی تعلیم اور تکنیکی تعلیم کے میدانوں میں بہت کچھ دیا۔ اس کی ایک نہایت اہم دین شعبۂ آثارِ قدیمہ تھا جو تاریخی عمارتوں کی دیکھ ریکھ کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس نے تعلیم کی ڈائرکٹوریٹ جنرل قائم کی جو صوبوں کے تعلیمی شعبوں کے لیے مرکزی دفتر کی حیثیت رکھتی تھی۔

1904 کا انڈین یونیورسٹیز ایکٹ جو 1902 کے انڈین یونیورسٹیز کمیشن کی تلاش و تحقیق کی بنیاد پر بنا تھا اس وقت تک مفید ثابت نہ ہوا جب تک برطانوی یونیورسٹیوں کی تنظیم میں تبدیلی نہ آ گئی، اور وہ تدریسی اور اقامتی نہ ہو گئیں۔ برطانوی یونیورسٹیوں میں جو بھی تبدیلی آتی اس کا اثر ہندوستانی یونیورسٹیوں پر پڑتا، اور متعلقہ ماہرین تعلیم اس پر سوچ بچار شروع کر دیتے۔ برطانوی یونیورسٹیوں میں آنے والی تبدیلیوں کے پیش نظر ہندوستان کی سرکار نے 1917 میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن مقرر کیا۔ اس کے سربراہ ڈاکٹر ایم ای سیڈلر تھے۔ انہی کے نام پر اسے سیڈلر کمیشن بھی کہا جاتا ہے۔ کمیشن نے تعلیم نسواں، تربیت اساتذہ، تکنیکی، پیشہ ورانہ اور حرفوں کی تعلیم و تربیت کو یونیورسٹی کے کاموں میں شامل کرنے کی رائے دی اور تجاویز پیش کیں۔ لیکن اس کی سب سے اہم سفارش یہ تھی کہ ڈھاکہ اور کلکتہ میں تدریسی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں، اور ان کالجوں کو ترقی دے کر تدریسی بنایا جائے جو اس کے مستحق ہوں۔ کمیشن نے انٹرمیڈیٹ کالج بنانے کی بھی تجویز رکھی۔

سرکار نے تعلیمی حکمت عملی کے طور پر 1913 میں پہلے ہی یہ قرارداد پاس کر دی تھی کہ کالجوں کو ترقی دے کر یونیورسٹیاں بنا دیا جائے، اور ہر صوبے میں ایک یونیورسٹی ہو۔ اس قرارداد اور کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی سفارش کی بنا پر 1915 اور 1920 کے درمیان پانچ سال کی مدت میں آدھی درجن سے زیادہ یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ 1915 اور 1920 کے درمیان جو یونیورسٹیاں

قائم ہوئیں ان کے نام یہ ہیں: میسور یونیورسٹی 1916 میں قائم ہوئی، پٹنہ یونیورسٹی 1917 میں، بنارس یونیورسٹی 17-1915 27ء میں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 1920 میں، لکھنؤ یونیورسٹی بھی 1920 میں، 1918 میں نظام نے حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی۔

1905 اور 1914 کا درمیانی دور جارحانہ قومی جذبات کا دور تھا، اور مشترکہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے 1857 کے بعد شاید دوسری دفعہ ہندو مسلم اتحاد نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ اس غیر معمولی قومی اتحاد نے قومی تعلیم کے خیال کو جنم دیا۔ یہ تعلیم سرکار کے اختیار اور دخل اندازی سے، غلامانہ تقلید سے، اور انگریزی زبان کے غلبے سے آزاد تھی۔ مزید یہ کہ اس میں حرفے کی تعلیم پر زور تھا تاکہ قومی اداروں سے نکلنے والے طلبا روزگار کے لیے سرکاری ملازمتوں کے محتاج نہ ہوں اور اپنی روزی خود کما سکیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس تعلیم کا مقصد مادرِ وطن سے محبت پیدا کرنا تھا۔

اوّلین قومی اسکول اس وقت وجود میں آئے جب تقسیم بنگال کے خلاف سرکاری اسکولوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ''بنگال میں قومی تعلیم کو فروغ دینے والی سوسائٹی'' قائم ہوئی جس نے پچاس (50) سے زیادہ اسکول قائم کیے۔ یہ اسکول جو بنگال کی تقسیم کے نتیجے میں قائم ہوئے تھے، بنگال کے متحد ہوتے ہی غائب ہو گئے۔ پھر عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی اور ناگپور کانگریس نے لوگوں کو تلقین کی کہ وہ اپنے بچوں کو سرکاری اداروں سے نکال لیں اور انھیں اُن قومی اسکولوں اور کالجوں میں داخل کرائیں جو جلد ہی اس مقصد کے لیے بنائے جانے والے تھے۔ چنانچہ 1920 میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی، اور اسی زمانے میں گجرات ودیا پیٹھ، بہار ودیا پیٹھ، کاشی ودیا پیٹھ، تلک مہاراشٹر ودیا پیٹھ اور بہت سے قومی اسکول اور کالج قائم ہوئے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک تعلیم کی نشو ونما کا مطالعہ کرنے کی کوشش، جیسی کہ ان اوراق میں کی گئی ہے، انیسویں صدی کے مغربی چیلنج اور مسلمانوں کے جوابی عمل کو سمجھنے کے لیے

نہایت ضروری ہے۔لیکن محض یہ مطالعہ اس چیلنج کی وسعت کو اور مسلمانوں کے جوابی عمل کے تنوع کو سمجھنے میں خاطر خواہ مدد نہ کر سکے گا۔اس چیلنج اور مسلمانوں کے جوابی عمل کو پورے طور سے سمجھنے کے لیے اُس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کو سمجھنا ضروری ہے۔اس لیے اس باب کے دوسرے حصے میں پلاسی کی جنگ کے بعد کے ایک سو بیس (120) برسوں میں مسلمانوں کے سماجی اور سیاسی حالات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کے سماجی اور سیاسی حالات

پلاسی (1757) اور بکسر (1764) کی جنگوں نے مغلوں کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی کمزوریاں کھول کر دکھائی دی تھیں۔لیکن انگریزوں نے وقتی مصلحت کے تحت مغل بادشاہ سے عصائے شاہی نہیں لیا تھا۔انھوں نے چھبیس لاکھ (2600000) روپے سالانہ کے عوض بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی سند حاصل کر لی تھی۔گویا ان علاقوں سے وہ مال گذاری وصول کر سکتے تھے۔مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کسی فرد کو نہیں بلکہ ایک تجارتی کمپنی کو یہ سند دے دے۔یہ ایک ایسا اقدام تھا جس کی نظیر پہلے نہیں ملتی۔

دیوانی کی سند حاصل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو مال گذاری کا انتظام کرنے کا حق تو حاصل ہو ہی گیا تھا انھوں نے انصاف کے شعبوں کا انتظام بھی خود ہی سنبھال لیا۔مغل صوبہ دار کی حیثیت گھٹ کر ایک کٹھ پتلی کی سی رہ گئی۔بنگال کے صوبے پر اصل حکومت کمپنی کی ہی تھی۔اس حکومت کے تحت بنگال، بہار اور اڑیسہ کے مسلمانوں کی مالی حالت ابتر ہوتی ہی چلی گئی، حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا جب ''کسی بھی مسلمان کا امیر رہنا تقریباً ناممکن ہو گیا، حالانکہ ایک سو ستر (170) سال پہلے کسی اچھے گھر میں پیدا ہونے والے مسلمان کے لیے غریب ہونا ناممکن تھا''28۔

مسلمانوں کی خراب مالی حالت کا سبب مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف عدم اعتماد، شک و شبہ اور خوف تھا۔یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے کہ اس قسم کی

ذہنی کیفیت ان دو قوموں کے درمیان ہو جاتی ہے جن میں سے ایک نے دوسرے سے سیاسی قوت چھین لی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''طبقۂ اشراف سے تعلق رکھنے والا کوئی مسلمان فوج میں نہیں لیا جاتا تھا''29۔

کارنوالس ایسی بہت سی تبدیلیاں عمل میں لائے جن کی بنا پر مسلمانوں کو بڑے منظم طریقے سے مال گذاری وصول کرنے کے نظام سے علاحدہ کر دیا گیا30۔ استمراری بندوبست نے ، جو تبدیلیوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھی، ''مال گذاری وصول کرنے والے ان ہندوؤں کو، جو اس وقت تک غیر اہم عہدوں پر فائز تھے، اونچا اٹھا کر مالکانِ زمین بنا دیا، زمین پر انھیں حق ملکیت دے دیا گیا، اور دولت جمع کرنے کی چھوٹ دے دی گئی، جو مسلمانوں کی اپنی حکومت میں صرف انہی کے پاس رہتی''31۔

جواہر لعل نہرو کے مطابق ''یہ وہ عمل تھا جس نے نئے مسائل پیدا کر دیے، اور شاید یہیں سے ایک نئے ہندو مسلم مسئلے کی شروعات ہوئی''32۔

طبقۂ اشراف اور رؤسا کو فوج اور مال گذاری نظام سے علاحدہ رکھا گیا تو ان میں بے چینی پھیلی۔ لیکن مسلمانوں میں وہ لوگ بھی کچھ کم بے چین نہ تھے جو ملازمتیں کرتے تھے کیونکہ سرکار نے ایسے قدم اٹھائے تھے کہ ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہو گئے تھے۔

کمپنی کی حکومت کے شروع کے پچاس (50) برسوں میں مسلمان حکومت کے سارے شعبوں پر برقرار رہے۔ وہ مال گذاری وصول کرتے، پولیس کے افسر ہوتے، عدلیہ پر حاوی رہتے، فوجداری قانون کے بدستور منتظم رہے۔ غرضیکہ اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف میں ''سرکار کے سارے اعلیٰ اور ماتحت عہدوں پر مسلمان قابض رہے''33۔ پھر صورتِ حال بدلی اور شہری ملازمتوں پر بڑی تعداد میں انگریزوں اور ہندوؤں کا تقرر ہونے لگا۔ مسلمانوں سے غیر مسلموں کی طرف چلنے والا یہ عمل عدلیہ میں زیادہ واضح اور نمایاں تھا۔

اس تبدیلی سے پہلے مغلوں کی عدالتِ انصاف قاضی، مفتی اور میرِ عدل کے ذریعے مقدمات کی بالترتیب چھان بین کرتی تھی، شرعی قانون کی وضاحت کرتی تھی، اور فیصلوں کو نافذ کرتی تھی۔ غیر مسلموں کے معاملے میں مدعاعلیہ کے مذہبی قانون سے رجوع کیا جاتا تھا اور دھرم شاستروں کی ترجمانی کے لیے پنڈت مقرر کیے جاتے تھے۔

انگریزوں نے شروع میں تو مغلوں کے نظامِ عدل کو قائم رکھا، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تبدیلیاں آتی گئیں۔ قانونِ شرع کی جگہ عام قانون لیتا گیا، اور اس بدلتے ہوئے نظامِ عدل میں مغل کارکنوں کی تعداد اور اختیارات کم ہوتے گئے 34۔

اس لیے ہر تبدیلی کے ساتھ، خواہ وہ مال گذاری نظام میں ہو یا نظامِ عدل میں، مسلمانوں کے روزگار کے مواقع کم ہوتے چلے گئے۔ فوج نے اپنے دروازے مسلمانوں پر پہلے ہی بند کر دیے تھے، کاشتکاروں کا حال بھی کچھ اچھا نہیں تھا۔ یہی حالات تھے جب شاہ عبدالعزیز (1746-1824) نے جو ممتاز بزرگ شاہ ولی اللہ (1703-1762) کے بیٹے تھے، 1803 میں یہ فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالحرب (دشمن کا ملک) بن چکا ہے۔ فتویٰ تفصیل سے لکھا جا رہا ہے کیونکہ اسی کی بنا پر وہ تحریک شروع ہوئی جس سے مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین تعلقات اور زیادہ تلخ ہو گئے۔ فتویٰ مندرجہ ذیل ہے:

''اس شہر (دلی) میں امام المسلمین کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اصل طاقت عیسائی افسران کے پاس ہے۔ ان پر کوئی روک نہیں ہے، اور کفر کے احکامات کی نشر و اشاعت کا مطلب یہ ہے کہ انتظام اور انصاف میں، نظم و ضبط قائم رکھنے کے معاملے میں، تجارت، مالی امور، وصولِ مال گزاری، اور تحصیلِ محصولات میں —— ہر جگہ کفار (بے دین) قابض ہیں۔ ہاں، کچھ ایسے اسلامی معمولات ضرور ہیں جیسے جمعہ اور عیدین کی نمازیں، اذان اور گاؤکشی، جن میں وہ دخل نہیں دیتے۔ لیکن ان معمولات کی بنیاد ان کے لیے کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ بلا جھجک مسجدوں کو منہدم کر

دیتے ہیں، اور کوئی مسلمان یا ذمّی ان کی اجازت کے بغیر شہر یا اس کے نواحات میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ مسافروں اور تاجروں کو شہر میں آنے سے نہیں روکتے ہیں تو اس میں ان کا اپنا فائدہ ہے۔ اس کے برخلاف شجاع الملک اور ولائتی بیگم جیسے ممتاز افراد ان کی اجازت کے بغیر شہر میں آنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ یہاں (دلّی) سے کلکتہ تک عیسائیوں کو مکمل اختیار حاصل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدرآباد، رامپور، لکھنؤ وغیرہ کا انتظام انھوں نے مقامی حکام پر چھوڑ رکھا ہے، لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ مقامی حکام نے ان کی بالادستی تسلیم کرلی ہے، اور ان کے اختیار کو مان لیا ہے"35۔

یہ فتویٰ جس نے اس تحریک کو، جسے عرفِ عام میں وہابی تحریک کہا جاتا ہے، نہ صرف یہ کہ قانونی جواز فراہم کیا بلکہ اس بے اطمینانی کو بھی ظاہر کیا جو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ غلط نام سے پکاری جانے والی اس 'وہابی تحریک' کے قائد سید احمد بریلوی (1831-1786) تھے، جو شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ یہ تحریک کسی نہ کسی شکل میں تقریباً نصف صدی تک چلتی رہی۔ بنیادی طور پر یہ اصلاحِ مذہب کی تحریک تھی، جس کا مقصد "مذہب سے بدعتیں اور برائیاں دور کرکے مسلم سماج کو حیاتِ نو دینا تھا"36۔ لیکن تحریک کا سیاسی پہلو اس وقت کی غیر مسلم حکمراں قوتوں کے لیے ایک بڑا چیلنج بن گیا۔ پہلے سکھوں کے لیے اور پھر انگریزوں کے لیے۔

تحریک کے ولولہ انگیز قائد سید احمد بریلوی سکھوں سے لڑتے ہوئے بالاکوٹ میں شہید ہوگئے، لیکن تحریک کا زور قائد کی موت کے ساتھ ختم نہ ہوا۔ 1849 میں جب پنجاب انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو مخالفانہ کارروائیوں کا رخ سکھوں سے ہٹ کر انگریزوں کی طرف ہوگیا۔

یہ تحریک 1857 کے بعد تک چلتی رہی جس کا ثبوت یہ ہے کہ 1864 اور 1871 کے درمیان حکومتِ برطانیہ نے نام نہاد وہابیوں پر پانچ مقدمے دائر کیے37۔ 1857 کے غدر کو بھی اسی 'وہابی تحریک' سے زور ملا تھا38۔

جس تحریک کی ابتدا سید احمد بریلوی نے کی وہ اپنے سیاسی پہلو کے اعتبار سے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مخالفت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس پر تو اختلاف ہوسکتا ہے کہ یہ مخالفت کس حد تک تھی، لیکن نئے اور پرانے حاکموں کے درمیان مخالفت تھی ضرور۔ اس پوری صورتِ حال کا لازمی تقاضہ بھی یہی تھا، اور اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو روزگار کے مواقع نہیں دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے مسلمانوں کی حالت اتنی قابلِ رحم ہوگئی کہ کچھ عرصے بعد انھیں روزگار کے لئے بھیک مانگنی پڑی۔ ذیل کی عرضداشت جو اڑیسہ کے مسلمانوں نے کمشنر ای ڈبلیو مولونی کو پیش کی، مسلمانوں کی اس حالتِ زار پر بخوبی روشنی ڈالتی ہے جس کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے۔ ''نہایت کریم النفس اور شان و شوکت والی ملکۂ معظمہ کی نمک حلال رعیت ہونے کے سبب ہمیں اعتماد ہے کہ ملک کے انتظام میں ملازمتیں ملنے کا ہمیں بھی برابر کا حق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اڑیسہ کے محمڈن اس قدر پست حالت پر پہنچادیے گئے ہیں کہ اب انھیں اوپر اٹھنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ پیدائش شریف گھرانے میں، پیشے سے مفلس، سرپرستوں سے عاری، ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے ماہی بے آب ہوں۔ فلاشوں اور بخیلوں کی سی کیفیت نے، جو سابقہ سرکاری ملازمت ختم ہونے کے سبب ہے، ہمیں ایسی دائمی مایوسی میں مبتلا کردیا ہے کہ ہم اپنے دلوں کی گہرائی سے یہ بات کہہ رہے ہیں کہ ہم دنیا کے دور افتادہ کناروں تک سفر کرلیں گے، ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھ جائیں گے، سائبریا کے آفت زدہ علاقوں میں سرگرداں پھرلیں گے، اگر ہم کو یہ یقین ہوجائے کہ اس مسافرت کے بعد دس شلنگ فی ہفتہ کی اجرت پر ہمیں سرکاری ملازمت سے نواز دیا جائے گا''39۔

فارسی اخبار دوربین کی 14 جولائی 1849 کی اشاعت میں جو رپورٹ چھپی ہے وہ بھی اس سلسلے میں کچھ کم معلوماتی نہیں ہے۔ اس رپورٹ کا متن مندرجہ ذیل ہے:

''ہر طرح کی ملازمتیں، خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی، بتدریج مسلمانوں سے چھین کر دوسری

قوموں کے افراد، خصوصاً ہندوؤں کو دی جارہی ہیں۔ سرکار پابند ہوتی ہے کہ اپنی رعایا کے سارے طبقوں کو ایک نظر سے دیکھے، لیکن اب وہ وقت آ گیا ہے جب وہ کھلے بندوں اپنے گزٹوں میں چھانٹ کر محمڈنوں کو سرکاری عہدوں سے علاحدہ کر دیتی ہے۔ حال میں جب سندربن کے کمشنر کے دفتر میں بہت سی جگہیں خالی ہوئیں تو اس افسر نے سرکاری گزٹ میں یہ اشتہار دیا کہ ان پر صرف ہندوؤں کا تقرر کیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ محمڈن اب اس قدر نیچے جا چکے ہیں کہ سرکاری ملازمت کی اہلیت رکھنے کے باوجود سرکاری اطلاع نامے میں دانستہ علاحدہ کر دیے جاتے ہیں ان کی بے چارگی پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی، اور اعلیٰ حکام ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے'' 40۔

انگریزوں نے ذرا خیال نہیں کیا کہ زمین اور ٹیکس کی بابت ان کی حکمت عملی نے مسلمانوں کے شریف طبقات کو برباد کر دیا، اور استمراری بندوبست نے مسلمان زمینداروں کو تباہ کر دیا۔ نہ انھوں نے اس کی پرواہ کی کہ معافی کی زمینوں پر دوبارہ قبضہ کرنے سے مسلمانوں کا نظامِ تعلیم برباد ہو گیا 41۔

شمالی مغربی صوبہ (موجودہ یوپی) کا معاملہ مختلف تھا۔ 1857 سے پہلے مسلمانوں کو مراعات حاصل تھیں، اور 1857 کے بعد بھی شہری ملازمتوں میں ان کی نمائندگی صوبے کی کل آبادی کے تناسب سے زیادہ تھی 42۔ شمالی مغربی صوبے کی ملازمتوں کے معاملے میں مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک میں کمی کا سبب بعض مصنفین کے نزدیک 'وہابی' سرگرمیوں میں پیدا ہونے والی شدت تھی۔ یہی سبب تھا کہ امتیازی سلوک بڑے زور سے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں برتا گیا جہاں 'وہابیوں' کے قدم خوب جمے ہوئے تھے 43۔

دلّی اور اودھ میں مسلمانوں نے 1857 سے پہلے ہی مغربی تعلیم اور انگریزی زبان سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ آصف الدولہ (1792-1778) کے دور میں نیوٹن کی Principia کا ترجمہ عربی میں کیا گیا تھا۔ نواب سعادت علی خاں (1814-1798) کے زمانے میں ایک رصدگاہ

(جہاں موسمی حالات یا اجرامِ فلکی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے) بنائی گئی، اور غازی الدین حیدر (1814-1827) کے زمانے میں لکھنؤ میں ایک تجربہ گاہ بنوائی گئی۔ غازی الدین حیدر مشرقی اور مغربی زبانوں کے مطالعات کی بھی سرپرستی کرتا تھا44۔

دلّی کے برطانوی ریذیڈینٹ کمشنر کے حکم سے دلّی کالج میں 1827 میں انگریزی جماعت شروع کر دی گئی تھی، اور 1831 کے آخر تک اس میں تقریباً تین سو (300) طلبا داخلہ لے چکے تھے، جن میں سے بعض نہایت ممتاز صاحبِ علم ثابت ہوئے جیسے منشی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد45۔

لیکن 1857 سے پہلے عام طور سے شمالی مغربی صوبے، اودھ اور دلّی کے عام مسلمان انگریز کی مخالفت اور مغربی علوم و انگریزی زبان کو مسترد کرنے کے معاملے میں بہار، بنگال اور اڑیسہ کے مسلمانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ دلّی کے مسلمانوں کے ان ہی جذبات کو سی، ایف اینڈریوز نے کسی حد تک یوں ظاہر کیا ہے: ''دلّی کے محسن لوگوں نے جدید علم سے پڑنے والے سارے اثرات کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ حالانکہ سرکار نے وافر وظائف اور مفت تعلیم کی پیش کش کی، لیکن شہر کے اعلیٰ خاندانوں نے اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے سے انکار کر دیا''46۔

ان ہندوؤں نے بھی، جنھیں انگریزوں سے کوئی خاص شکایت نہیں تھی، مغربی تعلیم اور انگریزی زبان کے لیے اس اشتیاق کا اظہار نہیں کیا جو بنگال میں ان کے ہم مذہبوں نے دکھایا تھا47۔ بنارس ہندو کالج کے پرنسپل بیلینٹائن کے الفاظ میں مغربی تعلیم کے لیے شمالی مغربی صوبے کے ہندوؤں کا رویہ ہرگز ہمت افزا نہیں ہے48۔ مغربی تعلیم کے بارے میں اشتیاق کی اس کمی کا سبب جج مسٹر شور نے 1834 میں یہ بتایا کہ: ''جب تک انگریزی تعلیم ملازمت اور تنخواہ نہیں دلواتی، طلبا کی تعداد (انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے) کم ہی رہے گی49۔

مشنریات کی گنجائش چھوڑنے کے باوجود، اس مواد کی بنا پر جو اس ضمن میں فراہم ہو سکا

ہے، یہ نتیجہ بہر حال اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شمالی ہندوستان کے مسلمان عام طور پر ہر برطانوی چیز کے خلاف تھے، اور اسی لیے انگریزی تعلیم کے بھی خلاف تھے۔ سرکاری اسکولوں میں بچوں کو نہ بھیجنے کا ایک اضافی سبب یہ اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم انھیں عیسائی بنادے گی، کیونکہ ان کے نزدیک مغربی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد فروغ عیسائیت تھا50۔

عیسائی مشنریوں نے یہ بات کبھی پوشیدہ نہیں رکھی کہ ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا واحد مقصد تبدیلی مذہب تھا۔ لگتا ہے کہ سرکاری اسکولوں کا بھی یہی مقصد تھا۔ سرچارلس ٹریویلین نے برطانوی ایوان بالا کی منتخب کمیٹی کے سامنے 1853 میں شہادت دیتے ہوئے یہی بات کہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ''سرکار کے تعلیمی منصوبے کا بنیادی خاکہ اس خیال سے بنایا گیا ہے کہ مفید علم، کہ یہی اصطلاح عام طور سے سمجھی جاتی ہے، کو عام کر کے ہندوستان میں تمدن کو فروغ دیا جائے۔ جب کہ مشنری اداروں میں تعلیم کا خاکہ ان خطوط پر بنایا گیا ہے کہ مقامی باشندوں کو عیسائی بنایا جائے۔ یہ دونوں مقاصد بڑے واضح ہیں، لیکن یہ کسی صورت ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں''51۔

جب خود انگریز صاحبان مغربی تعلیم کے عیسائی اثرات کے قائل تھے تو مسلمان انھیں کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ ہوسکتا ہے شک وشبہ کے ماحول میں یہ احساس حد سے بڑھ گیا ہو، لیکن بہت سے مسلمانوں نے مغربی تعلیم کے منصوبے میں ایک واضح عیسائی منصوبہ ضرور دیکھا ہوگا۔

مشن اور سرکاری اسکولوں سے دور رہنے میں اگر مسلمانوں کو تبدیلی مذہب کا خوف نہ بھی رہا ہو تو عیسائی اثرات کا خوف ضرور رہا، اور ان کے خوف کو تقویت اس خیال سے ملی کہ انگریز ان کے مذہب میں دخل دینا چاہتے ہیں۔

قانون عدم استحقاق اور عہد معاونت 52 جیسے اقدامات سے نواب اور راجہ مستقل خوف زدہ رہتے تھے۔ اس خوف میں عوام بھی ان کے شریک تھے، جن کو یہ خوف دامن گیر رہتا کہ سرکار

ان کی اقتصادی، سماجی اور مذہبی زندگی میں دخل اندازی کے درپے ہے۔ خوف اور بے اعتمادی کے اس ماحول میں چربی لگے کارتوسوں کی آواز عوامی بغاوت کے پُرزور دھماکے میں بدل گئی۔

ہندو اور مسلمان دونوں نے 1857 کی بغاوت میں حصہ لیا، اور دونوں نے اس کے نتائج برداشت کیے۔ لیکن انگریزوں کے خیال میں بغاوت اگر کامیاب ہو جاتی تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوتا۔ اس لیے دونوں میں سے مسلمانوں کو زیادہ خطرناک سمجھا گیا53۔ اور قابو میں رکھنے کے لیے ان کے ساتھ بڑی بے رحمی کا برتاؤ کیا گیا54۔ گناہ گار اور بے گناہ میں فرق نہیں کیا گیا، اور بلا امتیاز موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جوشیلی مذہبی جماعت 'غازی' کے ہر فرد کو پھانسی دے دی گئی55۔

بغاوت کے مرکز دلّی میں فاتح برطانوی فوج نے شہری آبادی پر قیامت توڑ دی۔ برطانوی حکام نے پوری پوری آبادیاں مسمار کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ انسانی جان و مال کی اس تباہی کے بارے میں ایک شاہد کا بیان ہے کہ..... ''کسی کی زندگی محفوظ نہ تھی، قتل عام تھے، تشدد تقریباً ہر جگہ ہو رہا تھا، قلعۂ دلّی اور بڑی مسجد کے درمیان ہر مکان کو، سزا کے طور پر اور فوجی مصلحت کے تحت، مسمار کر کے زمین کے برابر کر دینے کے احکامات تھے''56۔

جن لوگوں نے 1857 کے خونیں واقعات بہ چشم خود دیکھے تھے ان کے ذہنوں پر گہرا اثر پڑا تھا۔ مولانا قاسم نانوتوی اور سید احمد خاں ایسے ہی دو عینی شاہد تھے۔ دونوں ہی اپنے اپنے طور سے بغاوت کے دوران سرگرم عمل تھے۔ بغاوت کے دوران ان کی سرگرمیوں نے مستقبل میں ان کے تعلیمی اور سیاسی کاموں کی سمت کا تعین کر دیا تھا۔ اول الذکر نے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی تھی، آخر الذکر نے مشکل وقت میں ان کی معاونت کی تھی۔ دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے، جو حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔

1857 کی بغاوت ان سیاسی سرگرمیوں کی منطقی انتہا تھی جو حضرت شاہ عبدالعزیز کے

1803 کے فتوے سے شروع ہوئی تھیں۔ اس کے نتائج شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھے۔ ایک پرانے سیاسی نظام کو بحال کرنے کا خیال ان کے دلوں میں اسی دن سے جاگزیں تھا جس دن انگریزوں نے اسے غصب کیا تھا، کیوں کہ پرانے طرزِ زندگی کو دوبارہ اپنانے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ 1857 سب ہی کے لیے، اور خاص طور سے مسلمانوں کے لیے، دورِ وسطیٰ کے اس ہندوستانی سماج کو بحال کرنے کی سرتوڑ کوشش تھی جس میں وہ حاوی تھے۔ مسلمانوں کے لیے پرانے سیاسی نظام کو بحال کرنے کی یہ کوشش اور بھی زیادہ سنجیدہ تھی کیونکہ اسی کے سائے میں ان کا سماج، ناپسندیدہ تبدیلیوں کے بغیر، پنپ سکتا تھا۔ لیکن پرانے نظام کو بحال کرنے کی کوشش میں وہ اور ہم وطن سب ناکام رہے، اور انھیں اس چیلنج کا سامنا کرنا پڑا جو سیاسی، مذہبی، سماجی، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی چاہتا تھا۔

مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے دوسرے ہم خیال افراد جن کی تربیت ولی اللہی روایت کے تحت ہوئی تھی، اس روایت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ''یہ لوگ ناراض مسلمانوں کے اس باغیانہ جذبے کی نمائندگی کرتے تھے جو فرائضی تحریک کے زمانے ہی سے کسی نہ کسی شکل میں اپنی اس بے چینی اور بے اطمینانی کا اظہار کر رہے تھے جو ایک بیرونی حکومت کے قیام اور دوام سے پیدا ہوئی تھی''57۔ قدرتی طور پر یہ انگریزوں سے کسی طرح کی مفاہمت کے حق میں نہیں تھے۔ شاید مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی جنگوں کے زمانے کی بھولی بسری دشمنی، انگریزوں کے ہاتھوں مغلوں کے سیاسی ڈھانچے کی شکست وریخت کے بعد، پھر سے عود کر آئی تھی۔ لیکن 1857 کی بغاوت نے کھل کر بتا دیا تھا کہ حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی روایتوں کو جنگی انداز کے اقدامات سے نہیں بلکہ پُر امن طریقوں سے قائم رکھا جائے۔ چنانچہ دیوبند میں دار العلوم قائم کیا گیا۔ انگریز ہندوستان میں 1947 تک ایک سیاسی قوت کے طور پر جب تک ختم نہ ہو گئے دار العلوم کا برطانیہ مخالف کردار قائم رہا۔

مولوی مملوک علی کے دوسرے شاگرد سید احمد نے حالات کو ایک دوسرے ہی زاویے سے دیکھا تھا۔ ایک سرکاری افسر ہونے کے سبب، اور 1857 کے پُر آشوب دنوں میں کچھ انگریز خاندانوں کو بچانے کی بنا پر، انھیں انگریزوں کا اعتماد حاصل ہو گیا تھا۔ اپنے ہم وطنوں، خصوصاً ہم مذہب لوگوں پر برطانوی فوج کے وحشیانہ مظالم دیکھ کر شروع میں وہ خود بھی خوفزدہ ہو گئے تھے، اور انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ مسلمان کسی ملک کو ہجرت کر جائیں گے۔ لیکن پھر یہ خیال چھوڑ دیا اور یہیں رُک گئے۔

انھیں بھی دوسروں کی طرح یہ یقین ہو گیا تھا کہ خواہ کتنا ہی زور لگایا جائے انگریز ہندوستان سے جانے والے نہیں۔ اس لئے انگریزوں کے سیاسی غلبے کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر مان لینا چاہیے، اور مسلمانوں کو مزاحمت چھوڑ کر انگریزوں سے مفاہمت کا رویہ اپنانا چاہیے۔ یہ تبدیلی تعلیم کے ذریعے آسکتی تھی۔ ایک ایسی تعلیم جس کا مواد اور کردار مغربی انداز کا ہو۔ لیکن وہ مغربی تعلیم کے عیسائی اثرات اور ہر اس چیز کے مخالف تھے جو غیر اسلامی ہو۔

عام مسلمان اس زمانے میں جسے مذہب سمجھتے تھے سرسید اس میں اصلاح چاہتے تھے، اور بعض اوقات اپنی اس کوشش میں بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ اصلاح کے اس جوش کی بنا پر ہم مذہب ان پر سخت تنقید کرتے، اور بہت لوگ انھیں مرتد سمجھنے لگے۔

وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان شک، خوف اور نفرت کے جذبات، جن کی بنا پر مسلمان اقتصادی طور پر پچھڑ گئے تھے، باہمی اعتماد اور اعتبار میں بدل جائیں۔ ان کے خیال میں مسلمان ہندوستانی سماج میں انگریزوں کا اعتماد حاصل کر کے اپنا وقار بحال کر سکتے تھے۔ رابنسن کے الفاظ میں سید احمد کا اوّلین مقصد، انھیں (مسلمانوں کو) اس لائق بنانا تھا کہ مستقبل کے ہندوستانی معاملات میں اُسی قوت کو روبہ عمل لا سکیں جو ماضی میں بروئے کار لاتے رہے تھے 58۔

ان کی سیاسی سرگرمیوں کو اسی 'افضل ترین مقصد' کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ان کا

خاصہ تھا اپنی فطرت کے عین مطابق انھوں نے اپنی شخصیت کا سارا زور اس مقصد کے حصول میں لگا دیا، اور اپنی زندگی میں ہی اس کو کسی حد تک حاصل بھی کر لیا۔ فرقہ واریت کی ابتدا جس کے نتیجے میں علاحدگی پسندی پیدا ہوئی، اور جس کے لیے کبھی کبھی انھیں مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے، ان کے خیالات کی بنا پر نہیں بلکہ زمین کے بندوبست کے بارے میں برطانوی حکمت عملی سے پیدا ہوئی تھی۔ S9۔

شمالی مغربی صوبے میں ہی، جہاں دارالعلوم اور مدرسۃ العلوم (شروع میں علی گڑھ کالج اسی نام سے جانا جاتا تھا) قائم ہوئے، کمپنی نے محصول جمع کرنے کے سب سے بڑے ذریعے کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ صوبے کے زمیندار کائستھوں اور برہمنوں کے ذریعے، جو علاقوں کے انتظام میں مہارت رکھتے تھے اور فارسی خوب جانتے تھے، کمپنی کے واسطے محصولات جمع کرتے تھے۔ کمپنی کو یہ نظام پسند نہ آیا۔ یہ نہ تو کمپنی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کر رہا تھا اور نہ حاکم کو محکوم سے ملنے دے رہا تھا۔ اس لئے کمپنی نے کچھ ایسے اقدامات کیے جن کے نتائج بڑے دوررس ہوئے۔ 1837 میں فارسی کی جگہ اردو کو دفتری زبان بنا دیا گیا۔ 1855 میں سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ تناسب کا اصول اپنا لیا گیا۔

1857 کے بعد جب برطانیہ کے ہندوستانی علاقے کمپنی سے تاجِ برطانیہ کے تحت منتقل ہو گئے تو افسر شاہی نظام میں مزید اصلاحات کی گئیں۔ نائب تحصیلدار، تحصیلدار اور منصف کے لئے مخصوص تعلیمی لیاقت لازمی قرار دے دی گئی۔ یہ حالات تھے جب متعصب ذہن کے ایک نئے لیفٹیننٹ گورنر شمالی مغربی صوبے میں تعینات ہوئے۔

سر انتھونی میکڈانل مسلمانوں کے بارے میں کچھ خاص تعصبات رکھتے تھے، جو ان کے قیامِ بنگال کے دوران پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ انداز پر روزگار دینے کے اصول کا اطلاق کیا، اور کوشش کی کہ ملازمتوں میں پانچ ہندو اور تین مسلمان کا

تناسب قائم ہوجائے۔ان کی حکمت عملی تھی کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے دور رکھا جائے60، کیونکہ ان کے خیال میں مسلمان برطانوی حکومت کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔1900 کی ناگری قرارداد جس کے تحت فارسی رسم الخط کے ساتھ ناگری رسم الخط کا جاننا ضروری تھا، سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد کم کرنے میں خاصی موثر ثابت ہوئی۔ پولیس میں مسلمانوں کی تعداد کم کردی گئی۔

ان اقدامات کی بناپر مسلمانوں کی تعداد عدلیہ اور انتظامیہ کی نچلی ملازمتوں میں کم ہوگئی۔ 1857 اور 1887 کی درمیانی مدت میں مندرجہ بالا ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد 63.9 فیصدی سے گھٹ کر 45.1 ہوگئی61۔

1857 کے بعد تین دہائیوں میں تعلیم، اصلاح مذہب اور مقامی حکومت خود اختیاری کے میدانوں میں جو تبدیلیاں آئیں ان کے سبب شمالی مغربی صوبے میں ہندو مسلمانوں سے اور بیگانے ہوگئے۔

انیسویں صدی کے وسط سے سرکار نے تحصیلوں کے صدر مقامات میں تحصیلی اسکول اور چار پانچ گاؤوں کے حلقوں کے کسی مرکزی مقام پر حلقہ بندی اسکول بنانے شروع کردیے تھے۔ ان اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم دیسی زبان تھی۔ یہ اسکول خاصے مقبول ہوگئے۔ 1881-1880 میں سرکاری اسکولوں میں طلبا کی تعداد 224000 تھی جب کہ نجی اسکولوں میں کل 68000 طلبا تھے۔ لیکن شمالی مغربی صوبے کے مسلمان سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی طرف کچھ زیادہ راغب نہیں تھے۔ 1881-1880 تک سرکاری کالجوں میں ہندو 75.2 فیصدی تھے اور مسلمان 12.6 فیصدی، اور سرکاری اسکولوں میں ہندو 81 فیصدی تھے اور مسلمان 16.6 فیصدی جب کہ اسی سال میں نجی اسکولوں میں ہندو 17.7 فیصدی اور مسلمان 43.7 فیصدی تھے62۔

ہر چند کہ شمالی مغربی صوبے کی شہری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد ان کی آبادی کے

تناسب سے اب بھی اچھی خاصی زیادہ تھی، لیکن اس تعداد میں برابر جو کمی ہو رہی تھی وہ خاصی معنی خیز تھی، اور اسے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے تئیں مسلمانوں کے کمزور جوابی عمل پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

انیسویں صدی ہندوؤں کی مذہبی اصلاحی تحریکوں، جیسے برہمو سماج (1828)، پرارتھنا سماج (1867) آریہ سماج (1875) کی بنا پر بھی جانی جاتی ہے۔ ان تنظیموں نے سماج سے ٹھگی، ستی، اور طفل کشی ختم کرنے میں بڑا قابلِ تعریف کردار ادا کیا ہے۔ لیکن اصلاحِ مذہب کی ان کوششوں کا بڑا سخت ردِ عمل بھی ہوا۔ دھرم سبھا، بھارت دھرم مہامنڈل اور بنارس ہندو یونیورسٹی اسی ردِ عمل کو ظاہر کرتے ہیں 63۔

آریہ سماج نے ہندو شناخت کی تلاش میں اس بات کی کوشش کی کہ خود کو خارجی اثرات سے، جن میں 'مسلمان حملہ آور' بھی شامل تھے، پاک کرلے۔ آریہ سماج کے انتہا پسندوں کی مانگ تھی کہ مسلمانوں کو یا تو ہندوستان سے نکال دیا جائے، یا پھر وہ آریہ سماج دھرم قبول کرلیں 64۔ 'شدھی' اور 'سنگٹھن' وجود میں آگئے، اور ان کے ساتھ مناظرے شروع ہوگئے جن میں ہندو پنڈت اور مسلم علماء مذہبی مسائل پر اپنی ذکاوت اور تیز فہمی کا مظاہرہ کرتے۔

ندوۃ العلماء کے قیام میں بظاہر کوئی سیاسی محرک شامل نہیں تھی۔ ندوہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں لکھنؤ میں قائم ہوا۔ یہ ایک دینی درس گاہ تھی جس کا مقام ترقی پسند علی گڑھ اور قدامت پسند دیوبند کے درمیان کہیں تھا۔ اگر علی گڑھ مسلمانوں کو ہندوستانی سماج میں پُر وقار مقام دلوانا چاہتا تھا تو ندوۃ العلوم، علما کو مسلم سماج میں پُر وقار مقام دلوانا چاہتا تھا۔ دیوبند کے مقابلے میں ندوہ علی گڑھ سے قدرے قریب تھا۔

یہ درست ہے کہ ندوہ نے سرکار سے وفاداری کا اظہار کیا، لیکن شبلی اور آزاد جو اس سے وابستہ رہے تھے، قومی سیاست میں شریک رہے۔ تحریکِ خلافت کے دوران اس کی ہمدردیاں

اہلِ خلافت کے ساتھ رہیں 65۔ کسی مرحلے پر ندوۃ العلماء کو سرکشی کا مرتکب بھی پایا گیا 66۔

1900 کی ناگری قرارداد نے علی گڑھ کے ممتاز لوگوں میں سرکار کے خلاف مخالفانہ جذبات ابھار دیے۔ لیکن میکڈانل نے کالج کی امداد بند کر دینے کی دھمکی دے کر انھیں دبا دیا۔ پھر بھی نوجوانوں کے ایک گروہ کو، جو ترقی پسندانہ خیالات کا حامی تھا، یہ یقین ہو گیا تھا کہ سرکار پر کتنا ہی اعتماد کیا جائے وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے جو کسی مقصد کے حصول کے لیے مستقل احتجاجی طریق کار اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے وہ ایک ایسی سیاسی تنظیم کے حق میں تھے جو مسلمانوں کے مخصوص مسائل پیش کر سکے، اور وہ مسائل جن کو علاحدہ سے پیش کرنے کی ضرورت نہ ہو، کانگریس سے الحاق کر کے پیش کیے جا سکتے تھے۔

اس طرح وہ 'نوجوان پارٹی' وجود میں آئی جو حکمتِ عملی وضع کرنے اور مالی معاملات میں سرکار پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے احتجاجی طریق کار کی وکالت کرتی تھی۔ خاص مقاصد کے حصول کے لیے احتجاجی مہم کی کامیابی کے طور پر 1911 کا اتحادِ بنگال دلیل کے طور پیش کیا جانے لگا۔ 'نوجوان پارٹی' کے افراد علی گڑھ کی 'قدیم پارٹی' کے افراد کو سرکاری سرپرستی پر بھروسہ نہ کرنے، اور سرکاری سرپرستی سے علاحدہ رکھنے کی برابر کوشش کرتے رہتے 67۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت تحریک کے دوران علی برادران مہاتما گاندھی کے ساتھ مل کر ترکی میں خلافت قائم کرنے کے لیے تحریکِ عدم تعاون کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ قومی سیاست ایک نئی بلندی پر پہنچ چکی تھی۔

اس تحریک کا ایک مقصد ایسے تعلیمی ادارے قائم کرنا تھا جو سرکاری اثر سے آزاد ہوں۔ چنانچہ 'نوجوان پارٹی' کی تحریک پر علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی گئی۔ جامعہ اس وقت وجود میں آئی جب ہندو مسلم اتحاد اپنی انتہا پر تھا۔ یہ ادارہ اپنے اسلامی کردار کے ساتھ اسی اتحاد کا نمائندہ

تھا۔

تعلیمی سطح پر یہ علی گڑھ اور دیوبند کو اپنے دائرۂ علم میں یکجا کرنے کی کوشش تھی 68۔ اس میں ذریعۂ تعلیم اردو تھی۔ اس کے نصاب میں مغربی عمرانی علوم شامل تھے اور بعد میں سائنس بھی شامل ہوگئی۔ اسلامیات اسکول اور کالج ہر سطح پر پڑھائی جاتی تھی۔

نصاب اور ذریعۂ تعلیم وغیرہ کے بارے میں جامعہ کے منتظمین کو دیوبند اور علی گڑھ سے، اور شاید تقسیمِ بنگال کے دنوں کے قومی اسکولوں سے، اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے تحریک ملی ہوگی۔

حوالہ جات

1. C.L. Reid, Inner History of East India Company, Abhishesh Publications, Chandigarh, 1979, P. 139.
2. Syed Mahmood, History of English Education in Inda, M.A.O. College, Aligarh, 1895, P.18
3. Syed Mahmood, op. cit., P. 19
4. Syed Mahmood, op. cit., P. 23
5. Syed Mahmood, op. cit, p. 23, 24
6. Baptist Missionaries

7- عبد اللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ہندوستانی اکاڈمی، 1936 صفحات 164 تا 165۔

ڈیوڈ ہیر لندن کے ایک گھڑی ساز کا بیٹا تھا۔ 1800 میں جب وہ 25 برس کا تھا کلکتہ آ گیا تھا۔ 1816 تک اس نے اتنی دولت جمع کر لی کہ اپنی تجارت کو خیر باد کہا اور بقیہ زندگی کلکتہ کے لوگوں کی فلاح کے لیے وقف کر دی۔ وہ راجہ رام موہن رائے اور دوارکا ناتھ ٹیگور کا قریبی دوست تھا۔ راجہ رام موہن رائے 1831 میں لندن گئے اور وہاں اس کے بھائی کے ہاں قیام کیا۔ راجہ رام موہن رائے 1833 میں فوت ہوئے اور برسٹل میں سپرد خاک ہوئے۔ راجہ کے کریا کرم کے

وقت ڈیوڈ ہیر کی بھتیجی موجود تھی۔

8۔ عبداللہ یوسف علی، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 181 تا 182

راجہ رام موہن رائے 1784 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی، عربی اور سنسکرت پڑھی۔ بعد میں انگریزی، فرانسیسی، لاطینی، یونانی اور عبرانی سیکھی۔ وہ برہمو سماج کے بانی تھے جس کا مقصد ہندو مذہب کی اصلاح تھی۔ وہ مغربی تعلیم کے بڑے حامی تھے اور کلکتہ کے ہندو کالج کے بانیوں میں سے تھے۔ مغل بادشاہ اکبر ثانی نے انھیں راجہ کا خطاب دیا تھا اور اپنے معاملے کی وکالت کروانے کے لیے 1831 میں انھیں انگلستان بھیجا تھا۔ راجہ کا انتقال 1833 میں ہوا، اور ان کی خاک برسٹل کے آرنوویل قبرستان میں دفنائی گئی۔ بعد میں ان کی سمادھی پر پتھر کی ایک چھتری بنادی گئی۔

9. Syed Mahmood, op. cit., p. 27

10. Syed Mahmood, op. cit., p. 51-52

11. Syed Mahmood, op. cit., p. 52

12. Syed Mahmood, op. cit., p. 52

13. Syed Mahmood, op. cit., p. 54

14. Syed Mahmood, op. cit., p. 58, 59

تعلیم کی کاؤنسل نے 4 جولائی، 1846 کو گورنر مارکوئس آف ٹویڈیل کو ایک خط بائبل کو سرکاری تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل کرنے کی بابت بھیجا۔ گورنر نے 24 اگست، 1846 کو اس تجویز کو اس ترمیم کے ساتھ منظوری دے دی کہ بائبل کی تعلیم اختیاری ہونی چاہیے۔ لیکن یہ تجویز جب کورٹ آف ڈائرکٹرس کی منظوری کے لئے بھیجی گئی تو انھوں نے 23 مارچ، 1847 کی مراسلت میں اسے رد کر دیا۔

15. Syed Mahmood, op. cit., p. 67

سرچارلس ٹریولین نے برطانوی ایوانِ بالا کی سیلیکٹ کمیٹی کے سامنے 28 جون 1853 کو یہ بیان دیا تھا۔ بیان اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا موادِ تعلیم پوری طرح سیکولر نہیں تھا:

'جیسے پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ انگریزی ادب کی کتابیں جیسے ملٹن، لاک، بیکن، ایڈیسن، اور جانسن، جو سرکاری اداروں میں پڑھائی جاتی ہیں، بائبل کی تلمیحات، اشاروں اور کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ انھیں اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ بار بار بائبل کے حوالے دیے جائیں۔ چنانچہ پڑھائی کے دوران اساتذہ اور طلبا برابر بائبل کے حوالے دیتے ہیں۔ امتحانات سے معلوم ہوتا ہے کہ نوعمر طلبا اسکول کے اندر اور باہر بائبل پڑھ کر عیسائی مذہب سے خوب واقف ہو جاتے ہیں۔ اس مشق کو روکنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

16. Syed Mahmood, op., cit. p85

انڈین ایجوکیشن کمیشن 1882 کا حوالہ

17. Nurullah S. and Naik J.P. A Students History of Education in India, Macmillan and Co., Bombay, 1956, p.119

J.A. Richter کا حوالہ

18. Syed Mahmood, op. cit. p.92

19. Nurullah and Naik, op. cit., p. 158

20. Syed Mahmood, op. cit., p. 99

انڈین ایجوکیشن کمیشن 1882 کی رپورٹ

21. Syed Mahmood, op. cit., p. 104

22. Nurullah and Naik, op. cit., p. 146

23. Nurullah and Naik, op. cit., p. 159

24. Nurullah and Naik, op. cit., p. 164

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ

25. Nurullah and Naik, op. cit., p. 217-220

انڈین یونیورسٹیز کمیشن 1902 کی سفارشات جو انڈین یونیورسٹیز ایکٹ 1904 میں شامل کی گئی ہیں ان کی تلخیص۔

26. Nurullah and Naik, op. cit., p. 223

500000 روپے یونیورسٹی اور کالج کی تعلیم کے لیے منظور کیے گئے، ان میں سے 135000 روپے یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے اور باقی کالج کی تعلیم کے لیے منظور کیے گئے۔ یہ اعلیٰ تعلیم کی مستقل امداد بن گئی۔

27۔ بنارس ہندو یونیورسٹی ایک ایکٹ کے تحت 1915 میں قائم کی گئی، لیکن اس نے کام 1917 سے شروع کیا۔

28. W.W.Hunter, Indian Mussalmans, The premier Book House, Lahore, 1964, p.117

29. W.W.Hunter, op. cit., p.118

30. W.W.Hunter, op.cit., p. 120

31. W.W. Hunter, op. cit., p. 121

32. Jawahar Lal Nehru, Discovery of India, Meridian Books Ltd. London, 1960, p. 303

33. W.W. Hunter, op. cit., p. 124

34۔ بڑے شہروں کے علاوہ جہاں برطانوی نظامِ عدل رائج ہو گیا تھا بنگال، بہار اور اڑیسہ میں ہر جگہ مغل عدالتیں ہی قائم رہیں۔ 1772 میں وارن ہسٹنگز نے دیوانی اور فوجداری کی ضلعی عدالتوں کی تنظیمِ نو کی، جس کے تحت دیوانی عدالت کی صدارت برطانوی کلکٹر کرتے اور مفتی اور پنڈت ان کی مدد کرتے۔ دیوانی اور فوجداری مقدموں میں بالترتیب صدر دیوانی عدالت اور صدر نظامت عدالت میں اپیل کی جاتی۔ صدر دیوانی عدالت کا حاکم اعلیٰ کمپنی کا گورنر ہوتا، اور صدر نظامت عدالت کے حاکمِ اعلیٰ کا تقرر یوں تو بظاہر نواب مرشد آباد کرتا لیکن حقیقتاً یہ بھی برطانوی افسران کرتے۔

1774 میں ایک عدالتِ عالیہ قائم کی گئی جس کے دائرۂ اختیار میں ہندوستان کے برطانوی باشندے، کمپنی کے ملازمین اور وہ ہندوستانی آتے تھے جن کا تنازعہ برطانوی افراد سے ہو۔ 1790 میں کارنوالس نے قانونِ شرعیہ میں ترمیم کی، اور اس کی جگہ اینگلو محمڈن قانون نافذ کر دیا۔ ضلعوں میں منصفوں کا تقرر کیا گیا اور وکیل کا پیشہ ہندوستانیوں کے لئے کھول دیا گیا۔ نچلی عدالتوں کے فیصلوں کی جانچ قاضی القضاۃ اور مفتی اعظم کرتے، اور اپنی رائے کے ساتھ ہندوستانیوں کی شہری عدالتِ عالیہ کو آخری فیصلے کے لئے بھیج دیتے جس میں گورنر جنرل اور اس کی کاؤنسل کے افراد ہوتے۔ مسلمانوں کے قانونِ فوجداری کا اطلاق جو ہر مقدمۂ فوجداری پر ہوتا رہا تھا 1832 میں ختم کر دیا گیا۔

35۔ شاہ عبدالعزیز، فتویٰ عزیزی، مطبع مجتبائی، دلی، 1311ھ، صفحہ 17

36. W.C. Smith, Modern Islam in India, London, 1946, p.161

37۔ پہلا مقدمہ امبالہ میں، دوسرا پٹنہ میں، تیسرا مالدہ میں، چوتھا راج محل میں اور پانچواں بنگال میں ہوا تھا۔ 1871 میں پانچویں مقدمے کے دوران بنگال کے چیف جسٹس کو ایک 'وہابی' مسلمان نے خود انہی کی عدالت کی سیڑھیوں پر مار دیا تھا۔ وائسرائے لارڈ میو کو ایک 'وہابی' قیدی، شیر علی نے مار دیا تھا جو انڈمان نکوبار جزائر میں عمر قید کاٹ رہا تھا۔

38. Z.H. Faruqi, The Deoband School and the Demand for Pakistan, Asia Publishing House, Bombay, 1963, p. 10

39. W.W. Hunter, op. cit., pp 131-132

یہ عرضداشت 1870 میں پیش کی گئی تھی۔

40. W.W. Hunter, op. cit., p. 131

41. Jawaharlal Nehru, op. cit., pp. 296-297

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے انگلستان کے حصہ داروں کو منافع دینے کی پریشانی میں سوچا کہ کمپنی کی آمدنی بڑھانے کے لیے معافی کی زمینوں پر دوبارہ قبضہ کر کے ضبط کر لیا جائے۔ ان زمینوں کی آمدنی سے بڑی تعداد میں ابتدائی اسکول اور کچھ اعلیٰ تعلیم کے ادارے چلتے تھے۔ کمپنی نے ایسی زمینوں کے مالکوں سے کاغذات طلب کیے، جو یا تو کھو چکے تھے یا انھیں دیمک چاٹ گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معافی کی زمینوں پر کمپنی نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔

42. Francis Robinson, Separatism Among Indian Muslims, Cambridge University Press, 1974, pp. 22, 23

فہرست II اور III دیکھیے۔

43. Ram Gopal, Indian Muslims, Asia Publishing House, 1959, p. 26

44. Aziz Ahmad, Islamic Modernism in India and Pakistan, Oxford University Press, London, 1967, p. 21

عبداللہ یوسف علی کا حوالہ دیا ہے۔

45. C.F. Andrews, Zakaullah of Delhi, W. Heffer & Sons, Cambridge, 1929, p. 38

46. C.F. Andrews, op. cit., p. 37

47. Syed Mahmood, op. cit., pp. 28,29

جب راجہ رام موہن رائے کو یہ معلوم ہوا کہ سرکار کلکتہ کے سنسکرت اسکول میں مشرقی علوم اور سنسکرت زبان کی تعلیم کو فروغ دینا چاہتی ہے، تو انھوں نے گورنر جنرل اِن کا ؤنسل، لارڈ امہرسٹ، کو یہ عرضداشت پیش کی کہ وہ ان کے ہم وطن لوگوں کو جدید تعلیم کی نعمت سے محروم نہ کریں۔ راجہ کا خیال تھا کہ سنسکرت ادب کی تعلیم سے 'کوئی فائدہ نہیں اور اگر ہے تو بہت معمولی سا' اور یہ کہ وہ فروغ علم کو روکتی ہے۔ خط کا پورا متن مندرجہ بالا صفحات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

48۔ عبداللہ یوسف علی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 169

Dr. J.R. Ballantyne کا حوالہ۔

49. Syed Mahmood, op. cit., p. 160

انڈیا آفس ریکارڈس کا حوالہ

50. C.F. Andrews, op. cit., p. 35

51. Syed Mahmood, op .cit., p. 67

52۔ عہدِ معاونت Subsidiasy Alliance، قانونِ عدم استحقاق Doctrine of Lapse

53. P.C. Joshi (ed.) Rebellion 1857, Peoples Publishing House, New Delhi, 1957, p. 56

54. Shan Mohammad, Sir Saiyyid Ahmad Khan, Menakshi Prakashan, Meerut, 1969, p. 32.

اشوک مہتا کا حوالہ دیا گیا ہے۔

55. Thompson and Garratt, Rise and Fulfilment of British Rule in India, Central Book Depot, Allahabad, 1962, p. 462

56. C.F. Andrews, op cit., pp. 72-73

57. Z.H. Faruqi, op. cit., p. 24

58. Francis Robinson, op. cit., p. 105

59. Jawaharlal Nehru, op. cit., p. 303 and 347

یہ نتیجہ نہرو کے ان بیانات سے اخذ کیا گیا ہے جو انھوں نے اوپر کے صفحات میں دیے ہیں۔

60. Francis Robinson, op. cit., p. 43

61. Francis Robinson, op. cit., p. 46

62. Francis Robinson, op. cit., p. 39

63. Francis Robinson, op. cit., p. 69

64. Francis Robinson, op. cit., p. 68

65. Aziz Ahmad, op. cit., p. 124

سید محمود کا حوالہ دیا ہے۔

66. Francis Robinson, op. cit. p., p. 134

انڈیا آفس لائبریری کے کاغذات میں 21 اکتوبر 1899 کو میکڈانل اور کرزن کی خط و کتابت میں کرزن کا حوالہ۔

67. Francis Robinson, op. cit., pp. 358-418

'نوجوان پارٹی' اور 'قدیم پارٹی' کی تفصیلات

68۔ مولانا محمود حسن، خطبۂ افتتاحیہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ — مقصد اور موقف، نئی دہلی۔ صفحہ 3۔

باب دوم

دارالعلوم دیوبند

1857 کی بغاوت کی بمشکل ایک دہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند[1] میں قائم ہوگیا۔ جن لوگوں نے اسے قائم کیا وہ بغاوت میں سرگرم عمل رہے تھے۔ وہ عام قسم کے باغی نہیں تھے۔ ان کی تربیت ولی اللہی مکتب فکر میں ہوئی تھی۔ ان کے مقاصد جنگ اور امن کے دوران ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھے۔ اور اسی لیے دارالعلوم 'سیاسی آزادی اور مذہبی نیز ثقافتی آزادی کے حصول کا،[2] ایک اور ذریعہ تھا۔ چونکہ دیوبند کی تخلیق میں بہت حد تک ولی اللہی فکر شامل ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں ذرا تفصیل سے جانا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ (1703 تا 1762) مغلوں کے زوال کے عینی شاہد تھے۔ انھوں نے عام لوگوں کی اخلاقی پستی اور حکمراں طبقے کے ہاتھوں ان کے اقتصادی استحصال کو خوب دیکھا تھا۔ انھوں نے ساری صورتِ حال کا معروضی انداز سے جائزہ لیا اور اس کی اصلاح کے لیے ایک حل پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی فکر پر جمود طاری ہوگیا ہے اور ان کے مختلف فرقوں میں اختلافات موجود ہیں۔ ان کو یقین تھا کہ یہ تنازعات قرآن کی تعلیم سے دور ہوسکتے ہیں

کیوں کہ قرآن ہی صحیح عقیدے کا سرچشمہ ہے۔اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کی تفسیر دلائل کے ساتھ دانشورانہ انداز میں پیش کی جائے۔ان کی شدید خواہش تھی کہ مذہب بدعتوں اور اخلاقی برائیوں سے پاک رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی خیالات بھی ان کے مذہبی خیالات سے کچھ کم انقلابی نہ تھے۔ان کا کہنا تھا کہ سماج مالدار حکمراں طبقے اور غریب محکوم رعیت کی ملی جلی شکل ہے۔حکمراں طبقے کی امارت اور رعیت کی غربت کی وجہ سے سماج میں توازن نہیں رہا ہے۔اس عدم توازن نے سماج کے اخلاقی ڈھانچے کو توڑ دیا ہے،اور بہت سے لوگوں کو ایک کم تر انسانی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔اقتصادی مساوات قائم کرنے کے لیے اس عدم توازن کو ختم کرنا ہوگا۔

ان کے نزدیک شہری زندگی کی بربادی کے دو سبب تھے۔پہلا، کچھ لوگ (بعض علما، امرا، مولوی اور شاعر) پورے طور سے بیت المال (سرکاری خزانے) کے دست نگر تھے۔انھوں نے بیت المال سے رقم حاصل کرنے کو پیشہ بنا رکھا تھا۔ان لوگوں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی تھی، اور یہ خود اپنے لیے، اور عوام کے لیے بھاری بوجھ بن گئے تھے۔شہری زندگی کی بربادی کا دوسرا سبب کسانوں، تاجروں اور اہلِ حرفہ پر بھاری محصول عائد کرنا تھا.....ایک اچھی شہری زندگی کے لیے ضروری ہے کہ محصولات ہلکے ہوں، اور ملازمین اس سے زیادہ نہ رکھے جائیں جتنے کی ضرورت ہو[4]۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے خیالات کی تشہیر کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں اور ایک مدرسہ قائم کیا۔انھوں نے اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا تا کہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ سکیں۔اس زمانے میں یہ بڑی جرأت کا کام تھا، کیونکہ لوگ سمجھتے تھے کہ قرآن شریف کو عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں پڑھنا بدعت ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی روایت کو ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز (1746 تا 1824) نے

قائم رکھا جو اپنے والد کی وفات کے بعد مدرسے کے مہتمم ہو گئے تھے۔ بیٹے نے بھی باپ کی طرح مذہبی علوم میں قرآن کو مرکزی حیثیت دی، اور ان تمام رسموں اور رواجوں کو رد کر دیا جو قرآن اور سنت سے میل نہیں کھاتے تھے۔

انھوں نے صرف مذہبی تعلیم پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے شاگردوں کو حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی اور اقتصادی نظریات کی بھی تعلیم دی۔ 1803 میں انھوں نے وہ مشہور فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالحرب بن گیا ہے، گویا مسلمانوں کو مذہبی قانون کی رو سے اجازت مل گئی کہ وہ یا تو کسی دوست ملک میں ہجرت کر جائیں، یا ظالم برطانوی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھالیں۔

1824 میں جب شاہ عبدالعزیز کا انتقال ہوا تو مولانا محمد اسحاق (1778 تا 1846) نے مدرسے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ مولانا محمد اسحاق شاہ عبدالعزیز کے نواسے تھے۔ انھیں اپنے نانا کا انقلابی جذبہ ورثے میں ملا تھا۔

1831 میں بالاکوٹ کے المیے کے بعد، جہاں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے اپنی جانیں دیں، مولانا محمد اسحاق نے نام نہاد 'وہابی تحریک' کو ذیل کے دو اصولوں کے گرد دوبارہ منظم کیا: (1) حنفی مذہب کی سختی سے پابندی، اور (2) ترکی کے سلطان سے تعاون۔ انھوں نے دلی سے اپنی غیر موجودگی کے زمانے میں پروگرام پر عمل کرنے اور اس کی تشہیر کرنے کے لیے ایک چار رکنی مجلس بنائی۔ اس مجلس کے صدر مولانا مملوک علی تھے جو مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے استاد تھے۔ یہ دونوں دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے۔ مولانا محمد اسحاق کا پروگرام ولی اللہی فکر سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ یوں بانیانِ دارالعلوم کا ان لوگوں سے براہِ راست تعلق تھا جو ولی اللہی روایت کے حامی تھے، اور جنھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ کے مذہبی اور سیاسی خیالات کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

اس لیے دیوبند میں مدرسے کے قیام کا خاص مقصد مذہب، تہذیب اور ثقافت کو محفوظ کرنا

اور ہمیشہ قائم رکھنا تھا۔ ان کی رائے میں مذہبی شعور، مذہبی تعلیم اور مذہبی جذبات اپنی پسند کی دنیا کی تعمیرِ نو میں مسلمانوں کی مدد کر سکتے تھے۔ مذہب جوان کے اسلامی وجود کی بنیاد تھا اگر جاتا رہا تو تعمیرِ نو کی ساری امید بھی ختم ہو جائے گی۔[5]

اس لیے دارالعلوم صرف مغربی علوم کے چیلنج ہی کا جواب نہیں تھا، بلکہ چیلنجوں کے اس پورے سلسلے کا جوابی عمل تھا جو مغربی تہذیب نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کے لیے پیدا کر دیے تھے۔ مدرسے کے پہلے طالب علم، مولانا محمود حسن نے یہی تاثر قائم کرنے کے لیے کہا تھا 'کیا میرے استاد مولانا نانوتوی نے یہ مدرسہ صرف پڑھنے پڑھانے کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میری موجودگی میں قائم ہوا تھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ ادارہ 1857 کی بغاوت کی ناکامی کے بعد ایک ایسا مرکز بنانے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا جہاں ایسے افراد کی تربیت ہو سکے جو 1857 کی ناکامیوں کی تلافی کر سکیں'[6]۔

1857 کے مخصوص حوالے کی بنا پر اس بیان کا لہجہ جارحانہ لگتا ہے، لیکن اس میں مغربی تہذیب کے گوناگوں چیلنج کی طرف اشارہ ہے جس نے دیسی تہذیب کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ مدرسہ اسی دیسی تہذیب کو نئی توانائی بخشنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

مولانا محمود حسن پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے سیاسی مقصد پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے، لیکن 1857 کی بغاوت میں مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے رول کے پیشِ نظر، ان کا مندرجہ بالا بیان حقیقت سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔

دارالعلوم کے بانیوں نے 1857 کی بغاوت میں علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ جوشیلے خود مولانا قاسم نانوتوی تھے، جو مدرسے کے خاص بانی تھے[7]۔ مدرسے کے ایک اور بانی مولانا رشید احمد گنگوہی نے، جو 1880 میں مولانا قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد مدرسے

کے مہتمم بنے، 1857 کی بغاوت میں اتنی ہی سرگرمی سے حصہ لیا جتنا خود مولانا نانوتوی نے لیا تھا۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد انھیں گرفتار کرلیا گیا، ان پر مقدمہ چلا اور رہا کر دیے گئے۔

مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی چونکہ مولوی مملوک علی کے شاگرد رہے تھے اس لیے ان کو حضرت شاہ ولی اللہ کی مذہبی اور سیاسی فکر تک براہِ راست رسائی حاصل تھی۔ ان کی زندگی کے واقعات گواہ ہیں کہ وہ اعلیٰ تصورات کے حامل اور پوری یکسوئی سے کام کرنے والے اشخاص تھے۔ اس لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ 1857 کی بغاوت میں انھوں نے معمولی باغیوں کی طرح حصہ لیا ہوگا۔ بغاوت میں ان کی شرکت کے پیچھے وہی خیالات کارفرما رہے ہوں گے جن سے سید احمد بریلوی (1786 تا 1831) اور شاہ اسماعیل شہید (1781 تا 1831) متاثر ہوئے تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ذہن میں شاید یہی چیزیں رہی ہوں گی جو انھوں نے یہ کہا تھا کہ 'میں ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتا جن کا مقصد صرف پڑھنا اور پڑھانا ہے۔ لیکن خود اپنے لیے میں نے اس منزل کا تعین کیا ہے، جس تک پہنچنے کے لئے میرے محترم استاد نے دارالعلوم قائم کیا تھا'۔[8]

جن حالات میں دارالعلوم دیوبند میں قائم کیا گیا تھا وہ زیرِ آب چلنے والی اس لہر کو حق بجانب ٹھہراتے ہیں جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے دوران وقتاً فوقتاً سطح کے اوپر بھی آجاتی تھی۔ چنانچہ یہ ادارہ 1866 میں اپنی ابتدا سے لے کر جب تک برطانوی حکومت 1947 میں ختم نہ ہوگئی، برابر برطانیہ مخالف ہی رہا۔

ہمیں بہرحال یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی بھی ادارہ جس نے تعلیمی دنیا میں دارالعلوم دیوبند کی طرح اپنا مقام بنایا ہو اتنی لمبی مدت تک جب ہی باقی رہ سکتا ہے جب وہ اپنے طویل مدت قیام میں دوسرے پہلوؤں کے مقابلے میں تعلیمی پہلو کو برابر اوّلیت دیتا رہا ہو۔ سیاسی پہلو تو

اچھے تعلیمی اداروں کی ترجیحات کے پیمانے میں کسی نیچے مقام پر ہی رہتا ہے۔ دارالعلوم کو بحیثیت تعلیمی ادارے کے آج جو شہرت حاصل ہے وہ کبھی حاصل نہ ہو پاتی اگر اس نے ایک ممتاز دینی درس گاہ بننے کا خواب نہ دیکھا ہوتا۔

اپنی برطانیہ مخالف حکمتِ عملی کے حوالے سے، جو ابتدا سے ہی اس کی بنیاد میں گہرائی تک موجود تھی، ادارے نے قومی اور بین الاقوامی سیاست کو جو کچھ دیا وہ ایسے افراد کی انفرادی کوششوں کی شکل میں تھا جیسے مولانا محمود حسن (1851 تا 1921)، مولانا عبیداللہ سندھی (1872 تا 1944)، اور مولانا حسین احمد مدنی (1879 تا 1957)۔ خود ادارے کے اندر ایک خانقاہ کی سی خاموشی اور سکون قائم رہا جو تعلیمی سرگرمیوں کے لیے پہلی شرط ہوتا ہے۔

مذہب کی جانب اور اس کی فہم کے لیے دارالعلوم کے طریقۂ فکر کی روح ولی اللہی تھی۔ اس کے نزدیک مذہب کی تشریح صرف قرآن اور سنت کی روشنی ہی میں کرنی چاہیے۔ ..... مکتب دیوبند کی مرکزی فکر اور بنیادی مذہبی طریقہ اہلِ سنت والجماعت کا جامع، معتدل اور ہمہ گیر طریقہ ہے[9]۔ اہلِ سنت والجماعت کی اصطلاح ان تمام مسلمانوں کے لئے استعمال ہوتی ہے جو پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ علما اور مذہبی اشخاص وہ اہلِ علم لوگ ہوتے ہیں جو پیغمبر محمد ﷺ کے افعال و اقوال کا شعور رکھتے ہیں، اور اپنی زندگی کو ان کے نمونے پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مذہبی ہدایت کے لیے کتاب (قرآن شریف) اور سنت سے استفادہ کرنا چاہیے۔ یہ ہدایت بہترین طریقے سے مذہب کے وہ مستند طالب علم دے سکتے ہیں جیسے علما و فضلاء۔ یہ طریقہ بلاشبہ روایت کی تقلید کی طرف لے جاتا ہے۔ اور علمائے دیوبند روایت سے وابستگی پر بہت فخر کرتے ہیں۔ تمام روایتیں، خواہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں لائقِ تعظیم ہیں بشرطیکہ وہ لائقِ احتجاج نہ ہوں[10]۔

دارالعلوم میں تعلیم ایک خاص کردار بنانے کے لیے دی جاتی ہے۔اس کا تعلق صرف علمی امتیاز سے ہی نہیں ہے، بلکہ طلبا کی اخلاقی تربیت سے بھی ہے۔ دارالعلوم میں تعلیم کے ان دونوں پہلوؤں کو آسانی سے سمجھنے کے لیے ہم انھیں علمی اور عملی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ علمی پہلو کی خصوصیت یہ ہے کہ مذہبی مطالعے کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ کے اعتدال پسندانہ اور سارے پہلوؤں کا احاطہ کرنے والے طریقے کو اپنایا جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت شاہ ولی اللہ کے طریقے میں حنفی مکتب فقہ کو مرکزی حیثیت دینے کے باوجود مالکی، شافعی اور حنبلی مکاتب فقہ کو بھی ہم آہنگ کیا جاتا ہے [11]۔ یہ ہم آہنگی اس لیے ممکن ہے کہ تمام مکاتیب فقہ کا دارومدار قرآن اور حدیث پر ہے۔

دارالعلوم میں تعلیم کے عملی پہلو کا مقصد یہ ہے کہ کسی نہ کسی صوفیہ سلسلے سے تعلق قائم کیا جائے اور اس وسیلے سے اخلاق کی افزائش ہو۔ دارالعلوم کی بیشتر ممتاز شخصیات یا تو چشتیہ سلسلے سے یا نقشبندیہ سلسلے سے فیض یاب ہوئی تھیں۔ چشتیہ سلسلے کی ممتاز شخصیت شاہ عبدالرحیم ولائتی تھے، اور نقشبندیہ سلسلے کی مشہور زمانہ شخصیت سید احمد بریلوی تھے۔ گو دونوں سلسلوں کے صوفیہ بظاہر ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی تھا یعنی اللہ سے دلی تعلق اور محبت۔ دونوں سلسلے حاجی امداداللہ کی ذات میں ایک ہو گئے تھے، اور ان سے مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی میں منتقل ہوئے تھے [12]۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ دارالعلوم کی تعلیم خواہ نظری ہو یا عملی بڑی حد تک شاہ ولی اللہ کے خیالات سے متاثر تھی، اور ان صاحبِ عمل حضرات کے خیالات سے بھی جو شاہ ولی اللہ کے خیالات کو عمل میں لانا چاہتے تھے۔ نتیجتاً علمائے دیوبند ان بدعتوں یا بری رسموں، رواجوں کے خلاف تھے جو غیر اسلامی اثرات سے مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئے تھے، اور جن کی قرآن اور سنت میں اجازت نہیں تھی۔

ولی اللہی خیالات کا یہی خاکہ تھا جس کے تحت دیوبند کی چھتہ مسجد میں 1866 میں دارالعلوم مندرجہ ذیل مقاصد کے ساتھ قائم کیا گیا:

1۔ مسلمانوں کو قرآن، تفسیرِ قرآن، حدیث اور کلام کی تعلیم دینا، اور ایسی مہارتیں پیدا کرانا اور وہ معلومات فراہم کرنا جو ان علوم سے وابستہ ہوں، مسلمانوں کو اسلامی معلومات فراہم کرنا، تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت کرنا اور صحیح راستے پر مسلمانوں کی رہنمائی کرنا۔

2۔ طلبا کی زندگی میں اسلامی نظم وضبط پیدا کرنا، اور ان میں اسلامی جذبے کی نشوونما کرنا۔

3۔ اسلام کی تبلیغ وتحفظ، تحریر وتقریر کے ذریعے اسلام کی تبلیغ، مسلمانوں میں ایامِ پارینہ کی محترم شخصیات کا سا اخلاقی کردار پیدا کرنا۔

4۔ سرکار کے اثر سے گریز کرنا اور آزادیٔ خیال وعمل کو قائم رکھنا (یعنی علم کی فراہمی اور اشاعت)۔

5۔ مذہبی علوم کی ترویج واشاعت کے لیے مختلف مقامات پر عربی مدرسے قائم کرنا، اور دارالعلوم سے ان کا الحاق کرنا۔ [13]

دارالعلوم کے مقاصد سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دارالعلوم مذہبی شعور کو زندہ رکھنے کے لیے قائم کیا گیا تھا تاکہ مسلمان اس مغربی تہذیب کی تند وتیز لہروں میں کہیں بہہ نہ جائیں جو ہندوستان پر برطانوی تسلط کے بعد پھلے پھولے گی۔ اس سلسلے میں سرکاری اثرات سے گریز کرنے والا مقصد بہت واضح ہے۔

مقاصد سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ دارالعلوم کو مدارس کے ایک ایسے نظام کا مرکز بنانا مقصود تھا جو مجوزہ دارالعلوم کے مقاصد کے حصول میں شامل رہے۔

تاریخ

ان مقاصد کے پیشِ نظر عربی مدرسے کا افتتاح 30 مئی 1865ء کو چھتہ مسجد میں ہوا،

جو بعد میں بڑھ کر دارالعلوم بن گیا۔ افتتاحی تقریب بڑی سادہ تھی۔ ملا محمود دیوبندی نے محمود حسن کو ایک سبق پڑھایا، انہی محمود حسن کی قسمت میں بعد کو اسی مدرسے کا مہتمم بننا، شیخ الہند کا لقب حاصل کرنا، اور ہندوستان کی قومی تحریکِ آزادی میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا تھا۔ دارالعلوم کے بانیوں میں حاجی عابد حسین، مولوی محمد قاسم نانوتوی، مولوی مہتاب علی، مولوی ذوالفقار علی، مولوی فضل الرحمٰن، منشی فضلِ حق اور شیخ نہال احمد شامل تھے۔ یہی حضرات پہلی شوریٰ کے ممبر تھے، جو مدرسے کی سب سے اعلیٰ انتظامی مجلس تھی۔ حاجی عابد حسین مدرسے کے پہلے مہتمم تھے [14]۔

مدرسے میں نہ صرف تعلیم مفت تھی بلکہ رہائش، کھانا اور کتابیں بھی مفت تھیں۔ یہ سب اس لیے ممکن ہو سکا کہ مالی امداد کے لیے بانیانِ مدرسہ کی درخواست پر اطراف کے اضلاع کے باشندوں نے دل سے مدد دی۔ مدرسے کے پہلے سال میں ہی طلبا کی تعداد خاصی بڑھ گئی، اور قرآن، فارسی اور ریاضی پڑھانے کے لیے زائد جماعتیں کھولی گئیں۔

طلبا کی تعداد جلد ہی اتنی زیادہ ہو گئی کہ مدرسہ پہلے تو قاضی مسجد میں، اور پھر جامع مسجد دیوبند میں منتقل کرنا پڑا۔ طلبا کی تعداد کچھ اس تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ جامع مسجد بھی چھوٹی پڑ گئی۔ اس لیے 1857 میں شہر کے شمال مغرب میں ایک قطعۂ آراضی خریدا گیا، اور دوسرے سال ہی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا۔ جو پہلی تعمیر ہوئی اس کا نام نودرہ یعنی نو محرابیں رکھا گیا۔

قائم ہونے کی ایک دہائی کے اندر مدرسہ اتنا مقبول ہوا کہ مذہبی امور پر اس کے علما کی ماہرانہ رائے لی جانے لگی۔ بلند شہر اور سہارنپور کے متعدد مقامات پر اس کی طرز کے مدرسے قائم ہو گئے۔ مولانا قاسم نانوتوی کی تحریک پر تھانہ بھون، امیٹھا، مظفر نگر، اور گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) میں مدرسے بن گئے۔ ان مدرسوں کا الحاق دیوبند سے ہو گیا، اور دیوبند کے اساتذہ ان کے امتحانات لینے لگے۔ اس طرح دیوبند کا مدرسہ، مدارس کا وہ نظام بنانے میں کامیاب ہو گیا جس کی بابت اس کے بانیوں نے شروع میں خاکہ تیار کیا تھا۔

1879 تک مدرسے میں کئی مضامین متعارف کرادیے گئے، اور طلبا کی کئی جماعتوں میں انھیں اچھی طرح پڑھایا بھی گیا۔ اس کے بعد سے اسے دارالعلوم یعنی یونیورسٹی کہا جانے لگا۔ پھر جلد ہی یونانی طب کے مطالعے کا بھی انتظام کردیا گیا۔

1880 میں مولانا قاسم نانوتوی کا انتقال ہوا، اور ادارے کی نشوونما کی پہلی منزل تمام ہوئی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مولانا قاسم نانوتوی جدید تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اولاً مذہبی تعلیم دینا چاہیے، اس لیے نہیں کہ یہ مسلمان بچوں کے لیے زیادہ اہم ہے بلکہ اس لیے کہ اس سے بچے کی استعداد بڑھے گی، فطری صلاحیتوں کی تربیت ہوگی، اور پھر اگر وہ مغربی تعلیم حاصل کرنا چاہے گا تو بڑھی ہوئی کارکردگی کی وجہ سے بہ آسانی ایسا کرسکے گا[15]۔

شاید یہ مغربی تعلیم کے لیے ایک رعایت رہی ہو، کیونکہ مغربی تعلیم نوجوانوں کے لیے روزگار کے دروازے کھول سکتی تھی۔ اگر یہ رعایت ہی رہی ہو تو بھی اس سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ دارالعلوم مغربی تعلیم کے مکمل طور پر خلاف نہیں تھا۔ قطع نظر اس اشارتی موافقت کے دارالعلوم بہرصورت ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کو قائم رکھنے کی ایک مثبت کوشش تھی، جہاں پر ان تعلیمات کو حکومت کی سرپرستی اور مراعات حاصل نہیں رہی تھیں۔

یہاں یہ بات بھی نظر میں رکھنی چاہیے کہ 1903 کے آس پاس ایک تجویز یہ تھی کہ ان طلبا کو وظائف دیے جائیں جو میٹرک کا امتحان پاس کرکے دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں، نیز ان کو بھی وظائف دیے جائیں جو دارالعلوم کی تعلیم سے فارغ ہوکر سرکاری اسکولوں میں داخلہ لینا چاہیں۔ لیکن مالی وسائل نہ ہونے کے سبب اس تجویز پر عمل درآمد نہ ہوسکا[16]۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دیوبند کے علما مغربی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔

1880 اور 1905 کی درمیانی مدت میں، جب مولانا رشید احمد گنگوہی دارالعلوم کے مہتمم تھے، ادارے کی سرگرمیوں میں تبدیج اضافہ ہوتا رہا۔ طب یونانی کے نصاب کو تقویت

ملی۔اس دوران میں شعبۂ افتا کو بھی تقویت ملی [17]۔ تجوید و قرأت کا نیا شعبہ کھلا۔ اسی زمانے کی قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں ادارے کو مالی امداد دینے کا رجحان خاصہ بڑھ گیا [18]۔ 1905 میں جب مولانا رشید احمد گنگوہی کا انتقال ہوا تو بانیانِ دارالعلوم کا آخری سرپرست بھی رخصت ہو گیا۔ لیکن دارالعلوم اب اپنی ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں وہ نہ صرف اپنی ساری روایتوں کے ساتھ قائم رہ سکتا تھا بلکہ مزید توسیع اور ترقی کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔

اب جو دور شروع ہوا وہ تیز رفتار تعمیراتی سرگرمیوں کا دور تھا، 1906، 1909 اور 1911، میں بالترتیب کتب خانہ، دارالحدیث اور مسجد کے سنگِ بنیاد رکھے گئے۔ 1910 میں مطبخ (باورچی خانہ) میں کام شروع ہو گیا، اور طلبا کی وہ پریشانیاں رفع ہو گئیں جو اقامت گاہ سے دور جا کر یا تو کسی فرد کے ذاتی مکان میں یا پھر کسی سستے ہوٹل میں کھانا کھانے سے پیدا ہوتی تھیں۔ اسی برس شعبۂ تبلیغ یعنی تبلیغِ اسلام کا شعبہ کھلا، جو یوں تو دارالعلوم کے بڑے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد کے حصول کے لیے کھلا تھا، لیکن اس کا فوری مقصد آریہ سماجیوں کے اثرات کو زائل کرنا تھا۔

دارالعلوم میں طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد سے عہدہ برآ ہونے کے لئے 1919 میں ایک نئی اقامت گاہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ اقامت گاہ دارالعلوم کی تعمیرات کے اس سلسلے میں ایک نیا اضافہ تھا جس میں دارالحدیث اور باب ظاہر پہلے ہی تعمیر ہو چکے تھے۔ باب ظاہر افغانستان کے شاہ ظاہر شاہ کے نام سے بنا تھا۔

1931 میں دارالتفسیر بنا جس کا گنبد سنگِ مرمر کا تھا۔ اس عمارت کی نچلی منزل ایک سال پہلے بنی تھی جو دارالحدیث کہلاتی ہے۔ اقامت گاہ کی تعمیر 1932 میں مکمل ہو گئی۔

خطاطی اور حرفہ کے شعبوں کا افتتاح بالترتیب 1936 اور 1937 میں ہوا۔ ان شعبوں کو شروع کرنے کا مقصد طلبا کے لیے روزگار کے دروازے کھولنا تھا۔ نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور نئے شعبے قائم ہوئے تو دارالعلوم کے تعلیمی کام خود بخود آگے بڑھنے لگے۔ مثال کے طور پر طب یونانی جو

1879 میں ایک معمولی سا کورس تھا برابر تقویت پاتا رہا حتیٰ کہ 1960 تک بڑھ کر چار سالہ کورس ہو گیا۔ ہندوستانی سرکار نے اسے تسلیم بھی کر لیا[19]۔

تعمیراتی کام جاری رہا، نئی عمارتیں بنتی گئیں، دارالعلوم کا علاقہ وسیع ہوتا گیا۔ نئی عمارتوں میں مہمان خانہ (گیسٹ ہاؤس)، دارالافتا (شعبۂ قانون)؛ دارالشفا (طبیہ کالج)، کتب خانہ (لائبریری)، افریقی اقامت گاہ اور دفترِ اہتمام (انتظامی بلاک) شامل ہو گئے تھے۔

دارالعلوم میں تعلیم کے انتظام کے لئے مندرجہ ذیل اعلیٰ مجلسیں قائم کی گئیں:

1۔ مجلسِ شوریٰ (اعلیٰ ترین مجلسِ انتظامیہ)

2۔ مجلسِ عامہ (مجلسِ منتظمہ)

3۔ مجلسِ علمیہ (مجلسِ تعلیمی)

مجلسِ شوریٰ سب سے بلند رتبے کی انتظامی مجلس ہے۔ تعلیمی اور انتظامی معاملات میں اس کی تجاویز پر عمل کرنے کے لیے دارالعلوم کے اساتذہ اور کارکنان پابند ہوتے ہیں۔ اس کے ممبران کی تعداد اکیس (21) ہوتی ہے، جن میں سے گیارہ (11) معروف علما ہونے چاہئیں۔ باقی مسلمانوں کے مختلف زمروں سے منتخب کیے جا سکتے ہیں، جن میں سے بہتر ہوگا کہ دو دیوبند کے باشندے بھی ہوں۔ مہتمم (ریکٹر) اور صدر مدرس (پرنسپل) اپنے عہدوں کی بنا پر شوریٰ کے ممبر ہوتے ہیں۔ شوریٰ کا جلسہ قمری سال میں کم از کم دو دفعہ ہونا چاہیے۔

مجلسِ عاملہ مجلسِ شوریٰ کے تحت کام کرتی ہے۔ وہ ان افراد پر نظر رکھتی ہے جو مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں پر عمل درآمد کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ مہتمم اور صدر مدرس تو اپنے عہدوں کی بنا پر مجلسِ عاملہ کے ممبر ہوتے ہیں، باقی سات (7) ممبران ہر سال مجلسِ شوریٰ کے ممبران میں سے انتخاب کے ذریعے اس کے ممبر بنتے ہیں۔ اس مجلس کے جلسے قمری سال میں عموماً چار دفعہ منعقد ہوتے ہیں۔

مجلسِ علمیہ ایک مشاورتی مجلس ہے جو صدر مدرس کو ادارے کی تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں مشورے دیتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے سارے اساتذہ اس کے ممبر ہوتے ہیں۔ مہتمم اور صدر مدرس اپنے عہدوں کی بنا پر اس مجلس کے بھی ممبر ہوتے ہیں[20]۔

مندرجہ بالا تنظیم جو برسوں کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں ظہور میں آئی ہے جدید یونیورسٹیوں کی تنظیم کے مانند ہے۔ اس تنظیم کے ذریعے بڑی تعداد میں لوگوں کو ادارے کی انتظامی اور تعلیمی سرگرمیوں میں شامل کیا گیا ہے۔ تنظیم محض نام کے لیے نہیں حقیقتاً جمہوری ہے، کیونکہ یہ ان لوگوں کو جواب دہ ہے جو مالی طور سے ادارے کی مدد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، اساتذہ اور کارکنان خود کو جس طرح تعلیم کے لیے وقف کر دیتے ہیں اس سے ان میں یہ اخلاقی جرأت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے ضمیر کی آواز ہی پر کسی بات سے اتفاق یا اختلاف کریں۔

مولانا شاہ رفیع الدین نے، (دارالعلوم کے دوسرے مہتمم تھے)، ''انتظام کے اصولِ ہشتگانہ'' وضع کیے تھے جن کی رو سے کسی شعبے کے کام کی تفصیلات تیار کرنے کے معاملے میں صدر شعبہ کو اختیارِ اعلیٰ حاصل ہوتا ہے[21]۔

نصاباتِ تعلیم

دارالعلوم کے نصاب عربی اور فارسی کے ان نصابات پر مشتمل ہیں جو پرانے مدارس میں رائج تھے، جن میں سب سے زیادہ مقبول نصاب درسِ نظامی تھا جو فرنگی محل کے ملا نظام الدین نے تیار کیا تھا[22]۔

مولانا قاسم نانوتوی نے جدید تعلیم کے دنیاوی فوائد کا اعتراف کر کے چاہا تھا کہ اسے اسلامی علوم کے ساتھ شامل کر لیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں ان کی حکمتِ عملی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے مختلف تھی جہاں مشرقی اور مغربی علوم کے مشترکہ نصاب تیار کیے گئے تھے۔ ان کی حکمتِ عملی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی مختلف تھی جہاں مغربی تعلیم مکمل ہو جانے

کے بعد مذہبی تعلیم دی جاتی تھی 23۔ مولانا قاسم نانوتوی کا خیال تھا کہ اگر طلبا چاہیں تو مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہو کر مغربی تعلیم حاصل کریں، اس سے پہلے نہیں۔ اور شاید یہی بات نظر میں رکھ کر تعلیم کی مدت دس برس سے گھٹا کر صرف چھ برس کر دی گئی تھی۔ مدرسے کی تعلیم کی مدت میں یہ کمی مدرسے کے قیام کے دو سال کے اندر کر دی گئی تھی 24۔

تعلیم کی مدت میں اس کی کمی کی بنا پر طلبا کو پڑھائی جانے والی کتابوں کی تعداد میں بھی کمی کرنی پڑتی تھی۔ مولانا قاسم نانوتوی نے کتابوں کی اس کمی کا سبب یہ بتایا تھا کہ چھ سال کی مدت تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور فرائض کی اہم کتابیں پڑھنے کے لیے کافی تھی۔ ان کا زور قرآن و سنت کے مطالعے پر تھا، منطق اور فلسفے پر نہیں۔ اس لیے منطق اور فلسفے کی متعدد کتابیں مجوزہ نصاب تعلیم سے خارج کر دی گئی تھیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی جو مولانا قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد دارالعلوم کے مہتمم بنے، منطق اور فلسفے کے اور بھی زیادہ مخالف تھے 25۔ صوفی نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ منطق اور فلسفے کے حق میں اس لیے تھے کہ "ان کے مطالعے سے اسلام کو اس مریضانہ ذہنیت سے نجات ملے گی جو ذہنیت عام مولوی اس پر طاری کر رہے ہیں"، 26۔ لیکن اس بات پر یقین کرنا بہر حال مشکل ہے کہ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کسی متنازعہ فیہ مسئلے پر بھی شاہ ولی اللہ کے خلاف کوئی عمل کریں گے۔

ان برسوں میں جب ادارہ کوئی شکل اختیار کر رہا تھا فلسفے کو نصاب تعلیم سے خارج کر دینے کے سبب اجتہاد کے امکانات کم ہو گئے اور تسلیم شدہ عقائد کی پابندی کے امکانات بڑھ گئے، اور اس طرح تخلیقی فکر پر روک لگ گئی 27۔

بہر حال منطق اور فلسفے کی جو کتابیں دارالعلوم کے نصاب سے نکال دی گئی تھیں رفتہ رفتہ ان علما کے دباؤ سے داخل نصاب ہو گئیں جو عربی مدارس سے درس نظامی پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے تھے 28۔ لیکن فلسفہ اور منطق پر چند پرانی کتابیں داخل نصاب ہو جانے سے تخلیقی فکر پیدا

ہونے میں کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔

بہتر ہوگا کہ اس موقع پر درس نظامی اور دارالعلوم میں رائج نصاب تعلیم کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ اس مقابلے سے دونوں نصابات کے مشترک اور مختلف نکات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

درسِ نظامی	دارالعلوم کا نصاب تعلیم
قواعد، علم صرف ونحو، میزان، منشعب، صرف میر	علوم وکتب درسِ نظامی کے مطابق
پنج گنج، فصول اکبری، نحو میر، شرح میعات عامل،	
ہدایت النحو، کافیہ شرح جامی،	
زبدۃ، شافیہ	علم الصیغہ، ابنِ عاقل، مفید الطالبین
بلاغت	
مختصر المعانی	درسِ نظامی کے مطابق
مطول	
	تلخیص المفتاح
فلسفہ	
میبذی کی شرح ہدایت الحکمۃ	درسِ نظامی کے مطابق
الشمس البازغہ، صدرا	
	امور عامہ
منطق	
سُلم العلوم، رسالہ میر زاہد، ملا جلال،	درسِ نظامی کے مطابق
شرح تہذیب، کبریٰ، الیاغوجی	
شرح الشمسیہ	مرقات، ملا حسن، حمد اللہ

صغریٰ، تہذیب	قاضی مبارک

علمِ کلام

شرح عقائدِ نسفی	درسِ نظامی کے مطابق
میر زاہد، شرح مواقف	شرح عقائدِ جلال
	مسامرہ

تفسیر

جلالین، جلال الدین محلی اور جلال الدین سیوطی	درسِ نظامی کے مطابق
بیضاوی	
	ابن کثیر

فقہ

شرح وقایہ	درسِ نظامی کے مطابق
ہدایہ	
	قُدوری، نورالایضاح، کنزالدقائق

اصولِ فقہ

نورالانوار، مسلم الثبوت، توضیح تلویح	درسِ نظامی کے مطابق
	حسامی، اصول الشاشی

حدیث

مشکوٰۃ المصابیح	درسِ نظامی کے مطابق
	بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد
	نسائی، شمائل ترمذی، طحاوی،

ابن ماجہ، موطاء امام مالک،

موطاء امام محمد

ریاضی اور نجوم

اقلیدس، تشریح الافلاک، شرح چغمنی، — درس نظامی کے مطابق

خلاصۃ الحساب، قوشجی — بست باب

اصول حدیث

نزہۃ النظر، نخبۃ الفکر

اصول تفسیر

الفوز الکبیر

سیرہ

رسالۂ سیرہ

فرائض

سراجی

عربی ادب

مقامات حریری، دیوان متنبی، حماسہ

سبع معلقات، نفحۃ العرب

تاریخ

دروس التاریخ، تاریخ ابی الفداء

مناظرہ

رشیدیہ

طب

شرح اسباب، نفیسی، قانونچہ

مجاز، ہمیات قانون [29]

دونوں نصابوں کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم کا نصاب درسِ نظامی پر مبنی ہے۔ دارالعلوم میں پڑھائی جانے والی زیادہ تر کتابیں اور مضامین وہی ہیں جو درسِ نظامی میں شامل ہیں۔ حدیث، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ، اور فرائض یعنی وہ مضامین جن کو خالص دینیات کے مضامین میں شمار کیا جا سکتا ہے، ان پر زور اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں ان سے متعلق زائد کتابیں اور مضامین شامل ہیں۔

نصاباتِ دارالعلوم کے اس دعوے کو بھی حق بجانب ثابت کرتے ہیں کہ دوسرے عربی مدارس کے مقابلے میں وہاں قرآن اور سنت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دارالعلوم کی ابتدائی حکمتِ عملی پر، جس کی رو سے معقولات یعنی فلسفہ اور منطق پر زور کم کرنا تھا، آج بھی اسی طرح عمل ہو رہا ہے۔ یہ تنقید اب بھی صحیح ہے کہ ابنِ سینا، فارابی اور ابنِ رشد جیسے فلسفیوں کے تخلیقی کام شاملِ نصاب نہیں ہیں [30]۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی حجت اللہ البالغہ حال ہی میں درجۂ تکمیل کے دوسرے سال میں شامل کی گئی ہے۔ [31]

گیارہ سالہ نصاب اولاً برسوں کی بنیاد پر یا کتابوں کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تھا، جماعتوں کی بنیاد پر نہیں۔ ہر برس طلبا کو اس برس کی مجوزہ کتابوں کو ختم کرنا ہوتا تھا جس کے بعد ان کو اگلے برس کی مجوزہ کتابیں پڑھنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ تقریباً آٹھ برس ان مجوزہ کتابوں کا قدرے گہرا مطالعہ کرنے کے بعد طلبا کو سندِ عالم یعنی پہلی سند کا امتحان دینا ہوتا۔ سندِ فاضل حاصل کرنے

کے لیے ایک سال اور درکار ہوتا، اور سندِ کامل حاصل کرنے کے لیے مزید دو سال درکار ہوتے۔ کتابوں یا برسوں کی بنیاد پر نصاب کی یہ تقسیم 1970 میں ختم کردی گئی اور اس کی جگہ نصاب کی تقسیم جماعتوں کی بنیاد پر ہوگئی۔

پہلی سند یعنی سندِ عالم ان طلبا کو دی جاتی ہے جنھوں نے علمِ حدیث کا اچھی طرح مطالعہ کرلیا ہو، یعنی دورۂ حدیث مکمل کرلیا ہو۔ اس طرح سندِ فاضل ان طلبا کو دی جاتی ہے جنھوں نے دورۂ تفسیر مکمل کرلیا ہو۔ سندِ کامل ان طلبا کو دی جاتی ہے جنھوں نے ریاضی، مناظرہ قسم کے مضامین کا مطالعہ کرنے کے علاوہ پہلی سندِ یعنی سند عالم کے مضامین پر خاصی حد تک قدرت حاصل کرلی ہو۔

جامعہ طبیہ ایک علاحدہ شعبہ ہے جو طبِ یونانی اور جراحی کا نصاب مکمل کرنے کے بعد سند دیتا ہے۔ اس سند کو حکومتِ ہند کی منظوری حاصل ہے 32۔ ان اسناد کے علاوہ تجوید و قرأت اور حفظِ قرآن کی اسناد متعلقہ شعبہ جات دیتے ہیں۔

دارالعلوم میں ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کا بھی بندوبست ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے درجاتِ ابتدائی ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لئے درجاتِ فارسی و ریاضی ہیں۔ ابتدائی کی چار جماعتیں ہیں، اور اعلیٰ تعلیم کی پانچ جماعتیں ہیں۔ درجاتِ ابتدائی کے نصاب پر دینیات کا غلبہ ہے۔ درجاتِ فارسی و ریاضی میں فارسی اور ریاضی پر زور دیا جاتا ہے۔ شعبۂ فارسی 1896 میں کھولا گیا تھا۔ اسی کو درجاتِ فارسی و ریاضی کہا جاتا ہے۔ اس کا نصاب حسبِ ذیل ہے:

فارسی اور اردو ادب

فارسی کی کتابیں: مفید نامہ، گلزارِ دبستان، کریما، گلستاں، پندنامۂ عطار، انشاء فارغ، بوستاں، رقعاتِ عالمگیری، سکندر نامہ، انوارِ سہیلی۔

اردو کی کتابیں: تعلیم الاسلام (قاعدہ حصہ اول، دوم، سوم)، اردو کی دوسری کتاب،

اردو کی تیسری کتاب۔

فارسی اور اردو قواعد:

فارسی کی کتابیں: آمد نامہ، رسالۂ نادر، احسان القواعد

اردو کی کتاب: رسالۂ قواعدِ اردو

ریاضی:

سو تک گنتی، جمع، تفریق، ضرب، تقسیم، پہاڑے، کسر کے پہاڑے، ذواضعافِ اقل مشترک، عادِ اعظم مشترک، مساوات، اعشاریہ مساوات کی ضرب اور تقسیم، مربع اور جذر، نفع اور نقصان، مربع ۔ مستطیل اور چاروں دیواروں کا رقبہ، اقلیدسی اشکال، طریقۂ اکائی، اوسط فیصد، نسبت اور تناسب۔ 34

تاریخ:

تاریخ الاسلام، سرور المحزون

جغرافیہ:

جغرافیہ سہارنپور، جغرافیہ صوبۂ متحدہ آگرہ واودھ، تذکرۂ سرزمینِ ہند، تذکرۂ سرزمینِ ایشیا۔

عربی ادب:

مفید الطالبین

صرف عربی:

میزان الصرف، منشعب، پنج گنج، صرفِ میر

عربی نحو:

نحوِ میر، شرح میعاتِ عامل

ہندی ادب:

ہندی پرائمر، شکشا سواپن

درجاتِ فارسی وریاضی کا نصاب اس معنیٰ میں سیکولر جا ہے نہ ہو جس معنیٰ میں نصابات کو سیکولر کہا جاتا ہے، لیکن اسے محض مذہبی مطالعہ جات کا نصاب بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور ہندی ادب کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔ ادب کے علاوہ نصاب میں شامل ساری کتابیں اردو میں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کتابوں میں اردو اصطلاحات اتنی زیادہ استعمال کی گئی ہیں کہ بعض اوقات ان قارئین کو بھی انھیں سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے جن کی اردو زبان کی استعداد خاصی اچھی ہوتی ہے۔

شعبۂ صرف عربی میں ادب کا تین سالہ کورس ہے جس میں عربی بولنے اور لکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کورس کو شروع کرنے کا سبب غالباً وہ پیہم تنقید تھی کہ عربی مدرسوں سے فارغ ہونے والے طلبا میں عربی زبان کی لیاقت اس درجے کی نہیں ہوتی جس درجے کی انگریزی زبان کی لیاقت جدید اسکولوں اور کالجوں سے فارغ شدہ طلبا میں ہوتی ہے۔ [35]

1970 میں دارالعلوم کے نصابات کتابوں کی تقسیم کے طریقے سے بدل کر جماعتوں کے طریقے پر ترتیب دیے گئے۔ تکمیل کے نصاب کو چار مخصوص نصابوں میں تقسیم کر دیا گیا، جن کے نام ہیں تکمیلِ تفسیر، تکمیلِ دینیات، تکمیلِ معقولات اور تکمیلِ ادب۔ آخر الذکر عربی ادب ہی کا مخصوص نصاب تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو دہائیوں سے عربی لکھنے اور بولنے پر اور زیادہ زور دیا جانے لگا ہے۔ اس سے پہلے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ طلبا عربی میں کتابیں پڑھیں گے تو عربی زبان کی لیاقت خود بخود اچھی خاصی ہو جائے گی۔ عربی ادب کے نئے نصابات متعارف کرانے کا جزوی سبب اسی مفروضے کی ناکامی ہے۔ لیکن عام طور پر نصابات قرآن اور حدیث کے مطالعے کے

خیال سے مرتب کیے گئے ہیں تا کہ ان کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔

طریقۂ تدریس

دارالعلوم میں تعلیم اور تعلم کے عمل کا مرکز کتاب رہی ہے، حالانکہ استاد کی حیثیت بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ جماعت میں درس کی شروعات اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے طالب علم بلند آواز سے کتاب پڑھتا ہے۔ پھر استاد اس حصۂ سبق کے مشکل الفاظ اور جملوں کی تشریح کرتا ہے تا کہ طلبا آسانی سے اس حصۂ سبق کو سمجھ سکیں۔ یہ تشریح ایک طویل عالمانہ تقریر کی شکل میں ہوتی ہے جس میں قابل بحث نکات کا خاص طور سے احاطہ کیا جاتا ہے۔ طلبا بھی نہ صرف اس خیال سے سوال پوچھتے ہیں کہ سبق کو سمجھ لیں، بلکہ اس پر بھی سوال پوچھتے ہیں کہ اس حصۂ سبق کو تحریر کرنے سے مصنف کا کیا مقصد ہے۔ سوال و جواب کے ذریعے زیر مطالعہ کتاب کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بحث و مباحثہ کے دوران گو زیادہ تر استاد ہی بولتا ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہوتا کہ یہ عمل یک طرفہ ہی ہو۔ بعض ذہین طلبا بھی مباحثے میں اپنے بس بھر اضافے کرتے ہیں۔ 36

دارالعلوم کی خصوصیات

دارالعلوم 1858 کے بعد کی دہائی میں قائم ہوا تھا۔ 1858 وہ برس تھا جب نام کی مغل بادشاہت کی جگہ تاجِ برطانیہ نے لے لی تھی۔ زمین سے متعلق اوقاف جن کی آمدنی سے تعلیمی ادارے عموماً چلا کرتے تھے سرکار نے ضبط کر لیے تھے۔ نتیجتاً مالی وسائل کی کمی کی بنا پر مدارس بند ہونے لگے۔ اب نہ یہ وقت تھا نہ موقع کہ نئے مدارس کھولنے یا پرانے قائم رکھنے کے لیے سرکار کی طرف دیکھا جائے۔ اس لیے مالی وسائل کا انتظام کرنا خود ان لوگوں کی ذمہ داری بن گئی تھی جو کوئی نیا مدرسہ کھولنا چاہتے ہوں۔ مولانا قاسم نانوتوی نے دیوبند میں قائم نیا مدرسہ چلانے کے لیے رقم حاصل کرنے کا ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا۔ عوام سے چندہ لینے کی حکمتِ عملی اپنائی گئی۔ عوام سے

چندہ لینے کی حکمتِ عملی سے نہ صرف یہ کہ مدرسہ جاری رکھنے میں مدد ملی بلکہ اس کے ذریعے مدرسے کے قدم عوام میں جم گئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو 'اصولِ ہشتگانہ' پیش کیے وہ قابلِ توجہ ہیں[37]:

1۔ ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ مدرسے کے بااختیار لوگوں کو عوام سے زیادہ سے زیادہ چندہ حاصل کرنے میں انتہائی دلچسپی لینی چاہیے۔ دوسروں کو بھی اس کارِ خیر پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ عوامی عطیات میں مسلسل اضافہ کرانے کی کوشش جاری رکھیں۔ مدرسے کے خیر خواہ حضرات اپنی اس ذمہ داری کو کبھی فراموش نہ کریں۔

2۔ سنجیدہ طور سے مسلسل یہ کوشش کرنی چاہیے کہ طلبا کے قیام کے لیے مستقل اور پسندیدہ قسم کا بندوبست ہو جائے۔

3۔ شوریٰ کے ممبران جن پر مدرسے کے انصرام کی ذمہ داری ہوتی ہے اس کے بنیادی مقصد کے حصول کے لیے وقف رہیں۔ ذہنی رویوں میں سختی ناپسندیدہ چیز ہوتی ہے۔ اپنی رائے دوسروں پر تھوپنے کے لیے ترکیبیں نہیں لڑانا چاہئیں۔ اللہ محفوظ رکھے! مدرسے کی بنیادیں اس دن ہل جائیں گی جس دن شوریٰ کے ممبران ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرنا چھوڑ دیں گے۔ باہر کے تجربہ کار اور ذہین لوگ جو مدرسے کے خیر خواہ ہوں انھیں بھی تعمیری مشورے دینے کا موقع دینا چاہیے۔

4۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ مدرسے کے اساتذہ ہم خیال ہوں۔ دنیاوی علما کی طرح نہ وہ خود پسند ہوں اور نہ دوسروں سے بے ادبی کریں۔ مدرسے کے لیے وہ دن بڑا ناخوشگوار ہوگا جب ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے (یعنی اساتذہ خود پسند اور بے ادب ہو جائیں)

5۔ نصاب اور طریقۂ تعلیم، جو پہلے تجویز کیا گیا ہے، یا جو بعد میں باہمی مشورے سے طے

پائے گا، اس کی سختی سے پابندی کی جائے، ورنہ یہ مدرسہ کامیاب نہ ہو پائے گا، اور اگر (کسی بنا پر) کامیاب ہوا بھی تو اپنے مقصد کو حاصل نہ کر پائے گا۔

6۔ جس وقت تک اس مدرسے کا ذریعۂ آمدنی مستقل اور یقینی نہیں ہے، اس وقت تک یہ مدرسہ انشاء اللہ قائم رہے گا، بشرطیکہ خلوصِ نیت کے ساتھ اس کے ((اللہ کے) رحم وکرم اور دردمندی پر کامل یقین ہو، لیکن جوں ہی اس کا کوئی یقینی ذریعۂ آمدنی ہوا جیسے زمین یا کارخانے کی شکل میں کوئی بڑی جائداد (اس کی مستقل ملکیت)، یا کسی نیک نیت شخص کا مستقل چندہ دینے کا وعدہ، تو لگتا یہ ہے کہ مدرسہ امید وبیم اور خوف ورجا کے جذبات سے، جو مشیتِ ایزدی پر تکیہ کرنے کا دائمی ذریعہ ہوتے ہیں، عاری ہو جائے گا، اور اسی وقت سے امدادِ غیبی کے خفیہ ذرائع سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے کارکنان آپس میں جھگڑنے لگیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آمدنی اور تعمیرات کے سلسلے میں غیر یقینی کی کیفیت باقی رہے۔

7۔ سرکار اور صاحبِ ثروت لوگوں کی شرکت بھی نقصان دہ ہوتی ہے۔

8۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ گمنام رہ کر چندہ دیتے ہیں ذریعۂ برکت ہوتے ہیں۔ ان کا خلوص مستقل ذریعۂ آمدنی کا ضامن ہوتا ہے۔

ان اصولوں میں سے اول، دوئم، ششم، ہفتم، اور ہشتم اصول عوامی چندے کو حکمتِ عملی کے طور پر اپنانے کے حق میں ہیں، اور ایسی حکمتِ عملی کو اپنانے کے سماجی اور اخلاقی فوائد پر روشنی ڈالتے ہیں۔ عوامی چندے وسیع تر تعلیمی آزادی کے محافظ ہوتے ہیں، اور بانیانِ دارالعلوم شروع ہی سے اس تعلیمی آزادی کے خواہاں تھے۔ وہ ادارے کے تعلیمی یا انتظامی معاملات میں سرکاری دخل اندازی کے قائل نہیں تھے، نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ صاحبِ ثروت اشخاص پہلے تو ادارے کو مالی امداد دیں اور پھر سرکار کی طرف سے ادارے پر اثر ڈالیں۔ آخر الذکر بات کو وہ ان نیک نیت لوگوں

کے حق میں ڈھیل دے دیتے تھے جو رضا کارانہ طور پر چندہ دیتے تھے۔

دارالعلوم کے پہلے مہتمم، حاجی عابد حسین، وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ادارے کو چندہ دیا۔ اس کے بعد کارکنانِ دارالعلوم کا یہ مستقل کام ہو گیا کہ چندہ جمع کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ علاقوں میں جاتے۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ قطع نظر مقدار اور رقومات کے جس قدر چندہ رقم یا جنس کی شکل میں کسی مذہب یا فرقے کے اشخاص سے ملے گا منظور کر لیں گے [38]۔ یہ درست ہے کہ عام طور پر چندہ جمع کرنے کے لیے مسلمانوں سے رجوع کیا جاتا تھا۔ اسی بنا پر چندہ دینے والے غیر مسلموں کی تعداد چندہ دینے والوں کی لمبی فہرست میں مستثنیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہی مستثنیات میں سے ایک نول کشور پریس کے مالک، منشی نول کشور تھے۔ وہ اپنا اخبار 'اودھ اخبار' پابندی سے بھیجتے تھے اور اپنے پریس کی مطبوعات وقتاً فوقتاً دارالعلوم کو بھیجتے تھے۔ راؤ امر سنگھ اپنا اخبار 'سفیر' مفت دارالعلوم بھیجا کرتے تھے [39]۔

مندرجہ ذیل جدول سے دیکھا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم کی بیشتر عمارتیں عوام کے عطیات سے مکمل کی گئیں۔ عوامی عطیات سے مدرسہ قائم کرنے اور چلانے کی حکمتِ عملی کی کامیابی کی تصدیق بھی اس جدول سے ہو جاتی ہے۔

جدول الف میں دارالعلوم کی عمارتیں اور ان کی تعمیر پر خرچ ہونے والی رقومات کے ذرائع دکھائے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عمارات کی تعمیر میں جو رقومات خرچ ہوئیں وہ کسی خاص طبقے کے لوگوں نے عطیہ نہیں کیں۔ جن لوگوں کے نام اس جدول میں شامل ہیں ان میں مالدار لوگ بھی ہیں، سب سے زیادہ مالدار شاہِ افغانستان، ظاہر شاہ ہیں۔ لیکن عطیات دینے والوں میں اکثریت ان بے نام اشخاص کی ہے جنھوں نے ادارے کی ترقی کے لیے اور اسے جاری رکھنے میں اپنی معمولی رقومات سے مدد دی ہے۔ یہ معمولی رقومات جمعہ کی نماز کے وقت دی جاتی تھیں، یا پھر جب دارالعلوم کا کوئی کارکن عطیہ دینے والے ان معمولی اشخاص کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

جدول الف

دارالعلوم کی عمارتیں اور عطیہ دینے والوں کے نام

نمبر شمار	عمارت کا نام	عطیہ دینے والے کا نام	سال	رقم	کیفیت
1۔	دیوبند کی جامع مسجد میں زائد کمرے		1873		دیوبند کی جامع مسجد میں کچھ کمرے تعمیر کروائے گئے تاکہ بڑھتے اور پھیلتے ہوئے عربی مدرسے کو جگہ مل سکے۔ یہ کمرے دیوبند کے لوگوں کے چندے سے تعمیر ہوئے۔
2۔	دارالعلوم کی عمارتوں کے لئے زمین		1874	۔	دیوبند اور متصل قصبات کے لوگوں نے معمولی رقم عطیہ کی۔
3۔	نودرہ		1875	۔	عمارتوں کے سلسلے کی پہلی عمارت، جو کثیر تعداد کے معمولی عطیات سے 1883 میں بن کر تیار ہوئی۔
4۔	دارالاقامہ	مولوی شوکت حسین اسسٹنٹ صوبیدار وارنگل	1894	7000 روپے	7000 روپے انھوں نے خود دیے اور باقی رقم کے لیے لوگوں سے اپیل کی۔

5۔	دارالطلباء	بیگم بھوپال شاہجہاں بیگم	1898	12000 روپے	اس رقم سے ہوسٹل (دارالطلباء) کے علاوہ صدر دروازے پر دفتر اور مہمان خانہ بنائے گئے۔
6۔	کتب خانہ	مینڈھو کے نواب یوسف علی خاں	1906	7000 روپے	میرٹھ کے کچھ اور لوگوں نے بھی اس عمارت کے لئے عطیے دیے۔
7۔	مسجد دارالعلوم کے لئے زمین	میرٹھ کے حاجی فصیح الدین	1907	15000 روپے	-
8۔	مسجد دارالعلوم	رندیر (سورت) کے حاجی غلام محمد	1909	19000 روپے	-
9۔	دارالحدیث	ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خاں	1913	13000 روپے	نواب نے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کو رقم قسطوں میں بھیجی تھی۔ دارالحدیث کی تعمیر کا تخمینہ ایک لاکھ روپے تھا۔ 1930 میں بن کر تیار ہوا۔
10۔	ریلوے اسٹیشن دیوبند کی مسجد	دہلی کے شیخ محمد ابراہیم، شیخ محمد یعقوب، شیخ محمد یٰسین	1914	5000 روپے	دارالعلوم مسجد کی دیکھ بھال کرتا ہے۔
11۔	جدید دارالاقامہ	-	1918	-	امرتسر کے لوگوں نے عطیات دیے۔

12۔	دارالعلوم کی مسجد کی توسیع	حیدرآباد کے سید زین العابدین	1930	۔	توسیع کا سارا خرچہ عطیہ کنندہ نے دیا۔
13۔	یادگارِ سعدی	حیدرآباد کے سرور خان	1937	۔	سارا خرچہ عطیہ کنندہ نے دیا۔
14۔	باب الظاہر	شاہِ افغانستان ظاہر شاہ	1940		
15۔	جدید دارالاقامہ	مدارس کے حاجی محمد اسماعیل، کلکتہ کے حاجی محمد دین، اور دیگر عطیہ کنندگان	1941	71000 روپے	حاجی اسماعیل نے 20000 روپے اور مدراس کے دیگر لوگوں نے 27000 روپے دیے۔ حاجی محمد دین نے 20000 روپے اور کلکتہ کے دیگر لوگوں نے 4000 روپے دیے۔
16۔	کتب خانے کا ہال	برما کے وزیرِ اعظم اونو اور برما کے عطیہ کنندگان	1957	20000 روپے	اونو نے 20000 روپے دیے، اور برما کے عطیہ کنندگان نے 1,88,000 روپے عطیہ کیے۔
17۔	جامعہ طبیہ	اوقاف کرنال	1955	۔	اوقاف نے شرط رکھی کہ اسپتال کا نام عظمتیہ شفا خانہ رکھا جائے۔

18۔	چھتہ مسجد	خورجہ کے میجر احمد سعید خاں	1969	۔	مولانا نانوتوی کا حجرہ اور برآمدہ عطیہ کنندہ کے خرچ سے بنایا گیا۔
19۔	اسپتال کا ایک وارڈ	آگرہ کے حافظ ارشاد الٰہی	1971	۔	کرنال کے اوقاف نے ایک اور وارڈ بنوایا، اسی سال افریقی ہوسٹل اور 6000 من غلہ رکھنے کے لئے گودام بھی تعمیر ہوئے۔

یہ تمام معلومات سید محبوب رضوی کی کتاب سے حاصل کی گئی ہیں جس کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے۔

اس ضمن میں جتنے مآخذ فراہم ہو سکے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی زمین خریدنی ہوتی یا کوئی عمارت تعمیر کرانی ہوتی تو دولتمند اور غریب ہر طرح کے لوگوں سے رقومات جمع کرنے کی کوشش کی جاتی۔ یہ کوشش عموماً بار آور ہوتی۔ دارالعلوم کے لیے عطیات قبول کرتے وقت امیر اور غریب میں امتیاز نہیں کیا جاتا۔ بظاہر یہ بات مولانا نانوتوی کے 'اصولِ ہشتگانہ'' کی روح کے منافی تھی۔ دارالعلوم کے کارکنان خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے تھے کہ وہ امیر عطیہ کنندگان کو ادارے پر سرکار کا اثر نہ ڈالنے دیں گے۔ نتیجتاً دارالعلوم تعلیمی اور سیاسی معاملات میں برابر آزادی اختیار کیے رہا۔

حیدر آباد اور بھوپال کی ریاستیں مالدار عطیہ کنندگان میں سب سے آگے رہیں۔ 1889 میں حیدر آباد کے کچھ لوگوں نے معین الاسلام نام کی ایک تنظیم قائم کی۔ یہ تنظیم دارالعلوم کے لیے رقومات جمع کرتی تھی۔ ریاست حیدر آباد پہلے 1200 روپے سالانہ دیتی رہی پھر یہ رقم بڑھا کر

12000 روپے سالانہ کردی گئی۔ اسی طرح ریاست بھوپال پہلے 1200 روپے سالانہ دیا کرتی تھی پھر بتدریج یہ رقم بڑھ کر 3000 روپے سالانہ ہوگئی۔ [40]

عطیات ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھے۔ دارالعلوم کے کارکنان اور طلبا کے رابطوں کے ذریعے دوسرے ممالک کے لوگ اور سرکاریں بھی کبھار عطیات دیا کرتی تھیں۔ دارالعلوم کی سالانہ رودادوں میں جن ممالک کے عطیہ کنندگان کا ذکر ہے ان میں افغانستان، برما، فرانس، مڈغاسکر، ماریشس، سعودی عرب، جنوبی افریقہ اور تنزانیہ کے نام شامل ہیں۔ افغانستان اور جنوبی افریقہ سے تعلقات مستقل قائم رہے۔ ان دونوں ملکوں سے داخلے کے لیے طلبا برابر آتے رہے۔ افغانستان اور جنوبی افریقہ سے مستقل تعلق کی علامتیں باب الظاہر اور افریقی اقامت گاہ کی شکل میں موجود ہیں۔

عوامی عطیات کی حکمتِ عملی کو ایک مستقل شعبے کی شکل دینے کے لیے 1936 میں شعبۂ تنظیم وترقی قائم کیا گیا۔ اس شعبے کا مقصد دارالعلوم سے فارغ شدہ طلبا اور ہمدردانِ دارالعلوم کو پورے ملک سے عطیات جمع کرنے کے لیے منظم کرنا تھا۔ شعبے کے ہر ممبر کو ادارے کے لیے ایک روپیہ سالانہ چندہ خود بھی دینا ہوتا تھا۔ ادارے کی ضرورت کے پیشِ نظر وقت وقت سے چندہ جمع کرنے والے افراد مقرر کیے جاتے تھے، اور مختلف علاقے ان کے سپرد کیے جاتے تھے۔ شعبہ رقم اور اشیا دونوں شکلوں میں عطیات قبول کرتا تھا۔ یہ شعبہ اب تک برقرار ہے، اور اب اس کی اوّلین ذمہ داری مطبخ کی سالانہ ضرورت کے لئے غلّہ اکٹھا کرنا ہے۔

مطبخ 1910 میں شروع ہوا تھا [41]۔ غلّہ آج کی طرح پہلے بھی قریب کے اضلاع کے کسان فراہم کرتے تھے۔ شعبۂ تنظیم وترقی دیوبند کے قریبی اضلاع کے کسانوں سے 6000 من غلّہ اکٹھا کرتا تھا۔ یہ مقدار مرکزی مطبخ کی سالانہ ضرورت کے لئے کافی ہوتی تھی، اور شاید اب بھی کافی ہوتی ہے۔

جس طرح رقم اور غلہ عطیوں کی شکل میں جمع کیے جاتے تھے اسی طرح دارالعلوم کے کتب خانے کے لیے عطیہ کنندگان سے کتابیں بھی قبول کی جاتی تھیں۔ کچھ ممتاز عطیہ کنندگان جنھوں نے کتب خانہ قائم کرنے کے لیے کتابیں عطیہ کیں ان میں میرٹھ کے شیخ الٰہی بخش، کانپور کے عبدالرحمٰن خاں اور لکھنؤ کے منشی نول کشور شامل ہیں۔ بعد میں بھی کچھ افراد نے اپنی کتابوں کے ذخیرے دارالعلوم کے کتب خانے کو عطیہ کیے، ان میں سے ایک صاحب جونپور کے مولوی عابد حسین تھے جنھوں نے 1901 میں اپنی بیش قیمت کتابیں دارالعلوم کو عطیہ کیں۔ [42]

دارالعلوم کو نہ صرف قائم رکھنے کے لیے بلکہ اس کی نشوونما کے لیے بھی عوامی عطیات پر جو بھروسہ کیا گیا، اس سے ادارے کی کارکردگی بڑھی، وہ زیادہ جمہوری ہوا، اور عطیہ کنندگان میں ادارے کے ساتھ ایک دلی تعلق قائم ہوگیا۔ ایک ادارہ جس کی بقا کا انحصار عوامی عطیات پر ہو، نہ نااہل ہوسکتا ہے اور نہ غیر جمہوری۔ نہ وہ جبر یا ترغیب کے تحت اپنا تعلیمی کردار بدل سکتا ہے، کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو عطیہ کنندگان کو اس پر اعتماد نہ رہے گا۔ اس لئے دارالعلوم کے سیاسی اور تعلیمی کردار میں جو یکسانیت پائی جاتی ہے وہ کلی طور پر نہ سہی جزوی طور پر ضرور عوامی چندوں کی حکمتِ عملی کی مرہونِ منت ہے۔

دارالعلوم شروع ہی سے برطانیہ مخالف تھا، اور وہ ہمیشہ ایسا ہی رہا۔ ملک کی آزادی سے پہلے کی آٹھ دہائیوں میں اس کی ادلتی بدلتی قسمت کی تاریخ کے دوران کبھی ایسا نہ ہوا کہ برطانیہ مخالف رویے میں کوئی نرمی آئی ہو۔ لیکن قومی سیاست میں شمولیت کے باوجود ایسا بھی کبھی نہ ہوا کہ ادارے کے تعلیمی معیار پر کوئی اثر پڑا ہو۔ ادارے کے ممتاز افراد جیسے مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی، وغیرہ نے قومی سیاست میں حصہ ضرور لیا، لیکن ادارہ بذاتِ خود اس پوری مدت میں حصولِ علم اور کردار سازی کے اپنے مقاصد پورے کرتا رہا۔

قومی سیاست میں ادارے کی بہت کچھ شمولیت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی سرگرمیوں

کے ذریعے بیان کی جاسکتی ہے۔ان کو یقین تھا کہ یہ ادارہ ان کے استادمحترم مولانا قاسم نانوتوی نے محض تعلیمی مشاغل کے لیے نہیں بلکہ 1857 کے نقصانات کی تلافی کے لیے قائم کیا تھا[43]۔ برطانیہ مخالف جذبات کا جوزور استاد میں تھا وہی زور شاگرد میں بھی تھا۔ جذبات کا یہ زور اس حدتک تھا کہ اپنی شدید بیماری کے باوجود، جو جان لیوا ثابت ہوئی، انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاحی جلسے کی صدارت اس لیے منظور کرلی کہ انھیں بتایا گیا تھا کہ ان کا یہ فعل برطانوی اصحاب کے ذہنی سکون کو درہم برہم کردے گا۔[44]

مولانا محمود حسن میں برطانیہ مخالف جذبات اہلِ برطانیہ کی اس مسلم مخالف حکمتِ عملی کی بنا پر تھے جس پر وہ ہندوستان کے اندر اور باہر عمل پیرا تھے۔ان کے خیال میں اہلِ برطانیہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے، اور جس قدر جلد ممکن ہو انھیں ہندوستان سے باہر نکال دیا جانا چاہیے۔[45] اور چنانچہ انھوں نے اپنی پُرزور شخصیت کی ساری قوت اس مقصد کے حصول میں صرف کردی۔

1885 کے بعد کے حالات سے، جب انڈین نیشنل کانگریس بن چکی تھی اور ایک دستوری انقلاب شروع ہو چکا تھا، انھیں یقین ہوگیا تھا کہ قومی سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے۔ 1900 میں یوپی میں ناگری رسم الخط کا اجرا، 1905 میں تقسیمِ بنگال اور 1906 میں مسلم لیگ کی تشکیل، ایسے قومی واقعات تھے جن کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں عداوت پیدا ہوگئی تھی، اور اہلِ برطانیہ کا مقصد، تقسیم کرو اور حکومت کرو، اچھی طرح حاصل ہونے کی امید بندھ گئی تھی۔

بین الاقوامی منظر بھی ان کے لیے اسی قدر پریشان کن تھا۔ترکی خلافت کو یورپی حریفوں، خصوصاً اہلِ برطانیہ کے ہاتھوں پے بہ پے شکستیں ہوئیں۔ان شکستوں کے نتیجے میں ترکی کی یورپی حدود ہاتھ سے نکل گئیں۔ترکی کے معاملات میں ان کی شرکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے زیرِ نگرانی دارالعلوم نے 1911 میں انجمن ہلال احمر (ریڈ کراس کا

مسلم متبادل) کو 65000 روپے عطیہ کیے۔

ملک کے اندر اور باہر ہونے والے ان سیاسی واقعات نے انھیں انتہائی درجے کے اقدامات پر اکسایا۔ انھوں نے افغانستان اور ترکی کی جنگی طور پر مدد کرنے اور برطانوی حکمرانوں کے خلاف ہندوستانی عوام کو شورش پر اکسانے کا منصوبہ بنایا۔[46]

اس منصوبے کے ابتدائی مدارج نافذ کرنے میں ان کے نہایت فعال شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی (1872 تا 1944)[47] نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ کابل میں ایک عبوری حکومت بنائی گئی جس کے سربراہ راجہ مہیندر پرتاپ تھے[48]۔ 1922 میں انڈین نیشنل کانگریس کی ایک شاخ کابل میں قائم کی گئی جس کے صدر مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔ امیر حبیب اللہ والی افغانستان نے مشورہ دیا کہ ہر کام میں ہندوؤں کو شامل رکھا جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس کو اپنانے میں اس مشورے سے خاطر خواہ اثر پڑا۔[49]

ہندوستان کی برطانوی حکومت کے ہاتھوں گرفتاری سے بچنے کے لیے مولانا محمود حسن نے 1915 میں ہندوستان چھوڑ دیا۔ وہ مدینہ میں ترک گورنر غالب پاشا سے ملے، اور وزیرِ جنگ انور پاشا سے بھی ملے۔ آخر الذکر نے ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کے خلاف شمال مغرب کے لوگوں کی مہم میں ان کی مدد کی یقین دہانی کا پیغام انہی کے ہاتھ بھجوایا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہندوستان پہنچتے اور لوگوں کو برطانوی سرکار کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرتے، مکہ کے شریف حسین نے عرب کے ترک حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ مولانا محمود حسن اور ان کے بعض رفقا کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ 1920 میں انھیں چھوڑ دیا گیا، اور ہندوستان واپس ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

بمبئی پہنچ کر وہ تحریکِ خلافت میں شامل ہو گئے، جس کے حامی سمجھتے تھے کہ برطانوی انتظامیہ نے ترکی اور مسئلۂ خلافت کے بارے میں جھوٹے وعدے کر کے انھیں فریب دیا ہے، اور

اس خیال سے غضبناک ہورہے تھے کہ حجاز کے مقاماتِ مقدسہ کا انتظام غیر مسلموں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔

تحریکِ خلافت نے ہندو مسلم اتحاد کو ایک نئی بلندی تک پہنچادیا۔ علما اور گاندھی جی نے کندھے سے کندھا ملا کر کام کیا۔ مسلمان کانگریس کی تائید کرنے لگے۔ لیکن انقرہ میں قائم ترک نیشنل اسمبلی نے 21 نومبر، 1922 کو یہ اعلان کردیا کہ خلافت اور ملوکیت دو مختلف تصور ہیں، اور فردِ واحد بیک وقت دونوں کی نمائندگی نہیں کرسکتا۔ لیکن اس اعلان سے پہلے ہی 1920 میں مولانا محمود حسن انتقال فرما چکے تھے۔ ترک نیشنل اسمبلی کے اعلان کے بعد خلافت تحریک کا جواز ہی باقی نہ رہا۔

مولانا محمود حسن کی سیاسی زندگی علماء دیوبند کی مذہبی اور سیاسی امنگوں کی آئینہ دار ہے۔ اسلام ان کا عقیدہ تھا اور ہندوستانی قومیت پر انھیں مکمل اعتماد تھا۔ وہ دونوں پر یقین رکھتے تھے لیکن اسی ترتیب میں۔ وہ شریعت کے پُرزور حامی تھے، اور اپنے اسلامی طریقِ زندگی میں کسی طرح کی دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔ سیاسی سطح پر انھوں نے پاکستان کے مطالبے کو مسترد کردیا اور مسلم لیگ کی صف میں نہیں کانگریس کی صف میں شامل ہوگئے۔

حوالہ جات

1۔ دیوبند ضلع سہارنپور میں ایک چھوٹا سا قصبہ اور تحصیل کا صدر مقام ہے۔ دہلی کے شمال میں تقریباً 147 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک بہت پرانا قصبہ ہے، اور اس کی تاریخ کا سلسلہ مہابھارت کے زمانے سے جاملتا ہے۔

2. Z.H. Faruqi, The Deoband School and the Demand for Pakistan, Asia Publishing House, Bombay, 1963, p. 23

3۔ سید عابد حسین، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، مکتبہ جامعہ، دہلی، 1964ء، صفحہ 63۔

4۔ سید عابد حسین، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 49، حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے حوالے سے۔

5۔ سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، حصہ اول، ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند، 1977، صفحہ 39۔

6۔ سید محبوب رضوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 44۔

7۔ تھانہ بھون اور شاملی میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا سبب عبدالرحیم کا واقعہ ہے۔ عبدالرحیم تھانہ بھون کے قاضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ہاتھی خریدنے کے لیے ضلع کے صدر مقام سہارنپور گئے تھے۔ عبدالرحیم کی اس بے ضرر خریداری کے بارے میں کسی نے مقامی برطانوی افسر سے یہ کہہ کر شکایت کی کہ ضرور اس کے پیچھے

کوئی سازش ہے۔شبہات سے مملو 1857 کے ماحول میں برطانوی افسر نے مخبر کے بیان پر یقین کرلیا،عبدالرحیم اوران کے ساتھیوں کوگرفتار کرلیا گیا،اور بغیر کسی تفتیش اور مقدمے کے پھانسی پر چڑھادیا۔عبدالرحیم کے بڑے بھائی قاضی عنایت علی برطانوی افسر کی ناانصافی پر طیش میں آگئے۔انھوں نے مشاورت کے لیے لوگوں کو بلایا تاکہ مستقبل کی راہِ عمل کا تعین کیا جائے۔افراد کی اکثریت کسی قسم کے تشدد کے خلاف تھی، لیکن مولانا قاسم نانوتوی نے بےانصاف برطانوی لوگوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی اتنے پُرزور انداز سے وکالت کی کہ سارے لوگ ان کے ساتھ ہوگئے،اور لڑائی شروع ہوگئی۔

(مناظر احسن گیلانی،سوانح قاسمی،جلد دوم،دارالعلوم دیوبند،صفحات 112 تا122)

8۔ سید محبوب رضوی،متذکرہ بالا کتاب،صفحہ 44۔

9۔ سید محبوب رضوی،متذکرہ بالا کتاب،صفحہ 25،دیباچہ قاری محمد طیب۔

10۔ سید محبوب رضوی،متذکرہ بالا کتاب،صفحہ 425۔

11۔ سید محبوب رضوی،متذکرہ بالا کتاب،صفحہ 29،دیباچہ قاری محمد طیب

12۔ سید محبوب رضوی،متذکرہ بالا کتاب،صفحات 33,32،دیباچہ قاری محمد طیب۔

13۔ سید محبوب رضوی،متذکرہ بالا کتاب،صفحہ 142

14۔ سید محبوب رضوی،متذکرہ بالا کتاب،صفحہ 157

15۔ مناظر احسن گیلانی،متذکرہ بالا کتاب،صفحہ 281

16۔ سید محبوب رضوی،متذکرہ بالا کتاب،صفحہ 208

17۔ ایک مشہور عالم مفتی عزیز الرحمٰن مفتی اعظم مقرر کیے گئے۔

18۔ دارالاقاموں کی تعمیر کے لیے بیگم بھوپال اور حیدرآباد کے بعض متمول لوگوں نے بڑی

رقومات دیں۔

19۔ سید محبوب رضوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 360

20۔ محمد طیب، دارالعلوم دیوبند، دفتر اہتمام، دارالعلوم دیوبند، 1965 صفحات 28، 29

21۔ محمد طیب، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 18

22۔ ملا نظام الدین (1677 تا 1748) قصبہ سہالی کے رہنے والے تھے جو لکھنو سے تقریباً بیس میل دور ہے۔ وہ ملا قطب الدین کے بیٹے تھے جو اورنگ زیب کے دور حکومت میں ایک پشتینی خاندانی عداوت میں مارے گئے تھے۔ اورنگ زیب نے واقعے کی تفتیش کروائی، قصورواروں کو سزا دی، اور مغموم خاندان کو لکھنؤ میں ایک کشادہ مکان 'فرنگی محل' عطا کیا۔ اس وقت ملا نظام الدین چودہ (14) سال کے تھے۔ وہ پچیس (25) سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوئے اور مدرّس بن گئے۔ ان کے بیٹے عبدالعلی بحرالعلوم کے خطاب سے نوازے گئے۔ ملا نظام الدین مثانے میں پتھری کے سبب اکھتر (71) سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔

(G.M.D. Sufi, Alminhaj, Sheikh Mohammad Ashraf, Lahore, 1941, pp. 71, 72)

23۔ مناظر احسن گیلانی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 276

24۔ مناظر احسن گیلانی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 286

25۔ مناظر احسن گیلانی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 292

26۔ G.M.D. Sufi, op. cit., p. 68

27۔ Z.H. Faruqi, op. cit., p. 32

28۔ مناظر احسن گیلانی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 292

29- درسِ نظامی G.M.D. Sufi, op. cit., pp. 73-75 سے لیا گیا ہے، اور دارالعلوم کا نصابِ تعلیم Z.H.Faruqi, op cit., pp. 33-35 سے لیا گیا ہے۔

30- Z.H. Faruqi, op cit., p. 32

31- محمد طیب، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 39

32- محمد طیب، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 31

33- محمد طیب، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 41 تا 43

34- محمد طیب، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 41 تا 43 ریاضی کی یہ اصطلاحات اصل کتاب سے پہلے انگریزی میں بدلی گئی تھیں، اب انگریزی سے پھر اردو میں بدلی گئی ہیں۔

35- مناظر احسن گیلانی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 290

36- سید محبوب رضوی، متذکرہ بالا کتاب، جلد دوم، صفحات 279، 280

37- Z.H. Faruqi, op. cit., pp 25-26

38- سید محبوب رضوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 152

39- ایضاً، صفحہ 194

40- ایضاً، صفحہ 217

41- ایضاً، صفحہ 41

42- ایضاً، صفحہ 207

43- ایضاً، صفحہ 44

44- حسین احمد مدنی، نقشِ حیات، جلد دوم، محبوب پرنٹنگ پریس، دیوبند، 1954، صفحہ 130

45- ایضاً، صفحہ 130

46- ایضاً، صفحہ 141

47۔ مولانا عبید اللہ سندھی ضلع سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک نومسلم کی کتاب تحفۃ الہند اور اسماعیل شہید کی کتاب تقویت الایمان سے بڑا اثر لیا اور مسلمان ہو گئے۔ مذہبی تعلیمات مکمل کرنے کے لیے 1889 میں وہ دیوبند آئے۔ مولانا محمود حسن نے شاہ ولی اللہ اور مولانا قاسم نانوتوی کی تحریروں سے انھیں روشناس کرایا۔ 1908 میں وہ دوبارہ دیوبند آئے، اور اپنے استاد کا منصوبہ نافذ کرنے کے لیے 1915 میں کابل چلے گئے۔ ہندوستان سے بیس سال غیر حاضری کے دوران وہ افغانستان، ترکی، روس وغیرہ ممالک میں رہے۔ انقلاب روس، انقلاب ترکی اور عرب قوم پرستی نے انھیں اسلام کی حمایت سے زیادہ قوم پرستی اور سیکولرازم کی حمایت کی طرف مائل کر دیا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے تو حامی تھے، لیکن گاندھی جی پر اعتراض کرتے تھے کہ انھوں نے مذہب کو سیاست میں شامل کر دیا تھا۔

48۔ راجہ مہیندر پرتاپ (1886 تا 1979) ضلع علی گڑھ کے قصبہ مڑسان میں پیدا ہوئے تھے۔ 1914 سے 1945 تک وہ ملک سے باہر رہے، اور ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ 1915 میں وہ آزاد ہندوستان کی عبوری حکومت کے صدر اور مولانا برکت اللہ وزیر اعظم بنے۔ بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قائم ہونے والی ہندوستان غدر پارٹی کے ساتھ بھی انھوں نے کام کیا۔ غدر پارٹی نے 1926 میں انھیں تبت بھیجا تا کہ وہ ہندوستان کی برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت منظم کریں۔ انھوں نے پہلے روس سے اور پھر جاپان سے مدد طلب کی۔ انھوں نے جاپان میں انڈیا لیگ بنائی۔ اپنے سیاسی مقاصد میں ناامید ہو کر وہ مذہب کی طرف مائل ہو گئے، اور ایک مبہم سا عالمی وفاقی بنا لیا۔

S. P. Sen (ed.), Dictionary of National Biography,
Institute of Historical Studies, Calcutta, 1974, pp. 10, 11.

49- حسین احمد مدنی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 146

باب سوم

ایم۔اے۔او۔کالج، علی گڑھ

انیسویں صدی میں اگر دیوبند قدیم رجحانات کا موئد تھا تو علی گڑھ مسلمانوں کے جدید رجحانات کا حامی تھا۔ دیوبند کا کردار آغاز سے ہی مشرقی اور اسلامی تھا، اور اس میں فارسی اور عربی کو وہی اعزازی حیثیت دی گئی تھی جو دورِ وسطیٰ کے اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں دی جاتی تھی۔ مزید برآں، وہ ابتدا سے ہی برطانیہ مخالف تھا، جس کی تصدیق مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود حسن اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے خردمند اور جہاں دیدہ حضرات کی حیات اور کارناموں سے ہوتی ہے۔

دوسری طرف علی گڑھ نے خود کو جدید اور سیکولر ادارہ ہونے کا دعویٰ کیا جہاں انگریزی کو اعزازی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی حکمتِ عملی ابتدا سے ہی برطانیہ موافق تھی، اور جنگِ بلقان اور تحریکِ خلافت کے دوران اس رویّے کو بدلنے کی بہتیری کوششیں کی گئیں لیکن علی گڑھ بدستور اپنی برطانیہ موافق حکمتِ عملی پر قائم رہا۔

اس میں شک نہیں کہ ملک کی سیاسی زندگی اور تعلیم کی بابت دیوبند اور علی گڑھ میں تقریباً

سارے ہی معاملات میں اختلافات تھے۔ پھر بھی کچھ بنیادی باتیں دونوں میں مشترک تھیں۔ فکر وعمل میں اختلافات کے باوجود دونوں ہی ادارے انیسویں صدی کے اس چیلنج کے جوابی عمل تھے جو مغربی تہذیب اور تعلیم نے پیدا کیا تھا۔ اس لیے دونوں ہی ادارے اس تعلیمی تحریک کا بھی حصہ تھے جو مغربی تعلیم کے چیلنج کے جوابی عمل کے طور پر شروع ہوئی تھی۔ کچھ لوگ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ عمل تو دہلی کالج کے قیام سے ہی شروع ہو گیا تھا[1]۔ ان کے اس دعوے کو اگر درست مان لیا جائے تب بھی یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی اس تعلیمی تحریک کے خط وخال 1857 کے بعد ہی نمودار ہوئے۔ 1857 کے واقعات کے بعد مسلمانوں کو اپنی انتہائی مایوس کن حیثیت کا صحیح اندازہ ہوا، اور انھوں نے مغربی تعلیم کے چیلنج کے جوابی عمل کی فوری ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اس لیے 1857 ہی وہ برس تھا جب تعلیم کی تحریک شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں عملاً شروع ہوئی۔

دونوں اداروں کا یہ دعویٰ بھی مشترک تھا کہ اداروں کا قیام مسلمان نوجوانوں کی تہذیبی اور تعلیمی تربیت کے لیے عمل میں آیا ہے۔ ان کے مابین جو اختلافات تھا وہ 'تہذیب' اور تعلیم کے مفاہیم کی بابت تھا۔ البتہ تبدّل کے معاملے میں علی گڑھ کو ایک گونہ سبقت حاصل تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کو قبول کر لیں، اور کوشاں تھا کہ مسلمان انگریزوں کے قریب آ جائیں۔ انگریزی تعلیم اور تہذیب کے تئیں رویوں کی یہ تبدیلی ہندوؤں خصوصاً بنگالی ہندوؤں میں پہلے ہی آ چکی تھی۔ علی گڑھ اس تبدیلی کا محرک بن گیا جو پہلے ہی وقت کی ضرورت بن چکی تھی۔ اس کا بانی اپنے ہم عصر دیوبند کے بانی کی طرح 1857 کی بھڑکتی سلگتی بھٹی میں تپ کر اعتدال پر آ چکا تھا۔ لیکن مولانا نانوتوی کے برخلاف سرسید (1817 تا 1898) نے 1857 کے اپنے تجربات سے ایک دوسرا ہی نتیجہ نکالا تھا۔

علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خاں نے برطانوی حکومت کی ملازمت اپنی پسند سے

اختیار کی تھی۔ مئی 1857 میں جب بغاوت پھوٹی تو وہ بجنور میں سب جج تھے۔ انھوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بہت سے انگریز مردوں اور عورتوں کو باغیوں کے قہر وغضب سے بچایا تھا۔ پانچ مہینے بعد' جب دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور دلی کے معصوم شہری برطانوی انتقام کا شکار ہو رہے تھے' وہ دلی پہنچے۔ ان کے چچا اور چچازاد بھائی قتل کیے جا چکے تھے، اور ان کی والدہ صدمے سے لب گور تھیں[2]۔

1857 کے جذباتی صدمات کے تحت انھوں نے ملک چھوڑ دینے کی ٹھانی۔ لیکن غور و فکر کے بعد انھیں احساس ہوا کہ یہ تو بڑی بزدلی کی بات ہوگی، بلکہ ایک غیر انسانی فعل ہوگا کہ قوم کو زبوں حالت میں چھوڑ کر محض اپنی جان بچانے کے لیے کسی محفوظ جگہ چلے جائیں[3]۔ اس لئے وہ یہیں رہے، اور آخر کار شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت سدھارنے کے لئے ایک پروگرام وضع کیا۔ ابتدا میں یہ ایک نہایت وسیع پروگرام تھا جس کا مقصد 'مسلمانوں کو ایک اعلیٰ درجے کی مہذب قوم بننے کی طرف مائل کرنا تھا تاکہ دنیا کی مہذب قومیں انھیں حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں، اور وہ بھی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جائیں اور مہذب قوم کہلائیں'[4]۔ یہ مقصد بڑا خیالی سا لگتا ہے، اور ایسی زبان میں بیان کیا گیا ہے کہ قابلِ حصول مقصد کے بجائے نیک خواہش زیادہ لگتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شروع میں اس مقصد کا حصول ناممکن سا لگا[5]۔

اس موضوع سے متعلق جو مواد دستیاب ہے اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ سرسید مسلمانوں کی خراب اقتصادی، سماجی اور اخلاقی حالت سے بہت پریشان تھے۔ انھوں نے مسلمان قوم کی خرابیوں اور ان کی اصلاح کے بارے میں ایک نظریہ قائم کیا تھا۔ ان کے مطابق مسلمانوں کی خراب حالت کا اصل سبب وہ اخلاقی خرابیاں تھیں جو مغل حکومت کے آخری دور میں پیدا ہوئی تھیں، اور پھر ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں اور زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ ان ساری خرابیوں کا علاج یہ تھا کہ مغربی علم حاصل کیا جائے، اور مغربی تہذیب کی صدقِ دلی سے قدر کی

جائے۔ لیکن انگریز اور مسلمان ایک دوسرے پر اس قدر شبہ کرتے تھے اور بے اعتمادی میں مبتلا تھے، کہ ایک دوسرے کی خوبیوں کی بھی قدر کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انگریزی تعلیم بھی ایک ایسی ہی خوبی تھی، شاید انگریزوں کی سب سے اعلیٰ خوبی۔ بے اعتمادی اور شبہے کے اس خراب ماحول کو، ایک دوسرے کے مذہب اور سماج کے صحیح ادراک کے ذریعے، اور مسلمانوں کو ملک کی سیاست سے دور رکھ کر، بدلا جاسکتا تھا اور دونوں لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جاسکتا تھا۔

انجیل اور قرآن پر ان کی تفاسیر اور مذہب اور سماج کے معاملات پر ان کی متعدد تحریریں[6]؛ نیز ان کے وقت میں مذہب اور سیاست کے مسائل پر ان کے موقف کو مسلمانوں کی پسماندگی اور اس کے امکانی حل کو، متذکرہ بالا نظریے کی روشنی میں ہی صحیح طور سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کی جس کوشش سے ہر شخص باخبر ہے وہ علی گڑھ کالج کا قیام ہے، حالانکہ مسلمانوں کو پستی سے اوپر اٹھا کر عزت اور توقیر کے اونچے مقام تک لے جانے کے لیے انھوں نے ایک بڑا جامع منصوبہ بنایا تھا[7]۔

'مسلمانوں کو مقامِ عزت' تک لے جانے کا سرسید کا بظاہر ہر خیالی مقصد انگلستان سے ان کی واپسی پر زیادہ واضح ہو چکا تھا۔ اب مقاصد یہ تھے: (ا) مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کرنا، (ب) ان کو ترقی پر مائل کرنا۔

وہ ذریعہ جس سے یہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی رسالہ تہذیب الاخلاق تھا۔ اس میں متعدد ایسے مضامین شائع ہوئے جن میں ایسے باطل خیالات کو رد کیا گیا تھا جن کو مسلمانوں نے غلطی سے ایمان کا جزو سمجھ لیا تھا۔ اس میں اخلاقی پستی کے ان نقصان دہ نتائج سے آگاہ کیا جاتا تھا جو سیاسی انحطاط کے دوران مسلمانوں میں گھر کر گئی تھی۔ مختصر یہ کہ اس میں ان ساری کمزوریوں کا احاطہ کیا گیا تھا جن کو اس دورِ ابتلا میں مذہبی منظوری حاصل ہو گئی تھی، اور جو مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کمزوری وہ بڑھا ہوا غرور تھا جو انھیں اپنے شاندار

ماضی پر تھا۔

اس رسالے نے مسلمانوں کو ان کی کمزوریاں دکھانے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسلام پر عیسائیوں کی بے جا تنقید کا جواب بھی دیا۔ وہ سارے اعتراضات جو حقائق پر مبنی نہیں تھے، اور عیسائیوں کے مسلم مخالف احساسات کی عکاسی کرتے تھے، سرسید اور ان کے رفقا نے تہذیب الاخلاق کے صفحات میں ان کے بڑے منصفانہ جوابات دیے۔

تہذیب الاخلاق میں طبع ہونے والے مضامین میں جدید یورپی علوم کی افادیت پر توجہ کی جاتی تھی۔ ان مضامین میں مغربی علوم کی اہمیت کم کرنے کے لیے مشرقی علوم کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی روش پر تنقید کی جاتی تھی، حالانکہ اب وہ وقت آن لگا تھا جب مغربی علوم کی افادیت اور خوبیاں دنیا پر ظاہر ہو چکی تھیں۔ تاہم گزری ہوئی صدیوں میں سائنس کے میدان میں مسلمانوں کی دین پر اور دورِ وسطیٰ میں ان کے تحقیق اور جستجو کے رجحان پر تہذیب الاخلاق کے صفحات میں اس بنا پر توجہ مرکوز کی گئی تا کہ مسلمانوں کو یاد دلایا جائے کہ اگر وہ چاہیں تو پھر ایسا کر سکتے ہیں[8]۔

تہذیب الاخلاق کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا خاص مقصد مسلمانوں کو اس تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ کرنا تھا جو ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد آئی تھی۔ یہ تبدیلی ان غلط عقائد کی عمارت کو ڈھا کر جو غلط قسم کے مذہبی رسم و رواج نے بنا دی تھی، اور جدید علوم اور تہذیب کی خوبیاں دکھا کر، مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول بنائی جا سکتی تھی۔

یہ بگڑے ہوئے مذہبی عقائد اور رسم و رواج ترقی اور نشو و نما کی راہ میں کھلی ہوئی رکاوٹ تھے۔ یہی سبب تھا کہ 1857 سے اپنی آخری سانس تک سرسید مذہبی مباحث میں مصروف رہے۔[9] ان کے اپنے الفاظ میں: 'ہم مذہبی خیالات سے گریز کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہمارے معاشرے کے مذہبی رسم و رواج اس کی روایتوں اور عادتوں میں اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ مذہبی مباحث میں

الجھے بغیر تہذیب اور شائستگی کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتے[10]۔

انگلستان کے سفر نے ان پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ تعلیم نے اہلِ برطانیہ کو دنیا کی سب سے زیادہ مہذب قوم بنانے میں بڑا موثر کردار ادا کیا تھا[11]۔ گو ان کی رائے میں ذریعۂ تعلیم اپنی زبان ہونی چاہیے تھی، لیکن ہندوستان کی مقامی زبانوں میں جدید علوم کا فقدان ہونے کی وجہ سے یہ مناسب لگتا تھا کہ مغربی علوم کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعے دی جائے[12]۔

اس لیے مقامِ عزت کا راستہ انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی علوم کے حصول سے گزرتا تھا۔ مزید برآں، مغربی تعلیم میں ایک چھپی ہوئی صلاحیت اس بات کی بھی ہے کہ وہ برے رسم و رواج کو جنھیں غلطی سے جزوِ مذہب سمجھ لیا گیا ہو مذہب سے علاحدہ کر دے۔ اس ضمن میں ان کے الفاظ یہ ہیں: 'مجھے یقین ہے کہ جوں جوں اس کا (جدید سائنس اور فلسفے کا) دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، لوگ ان نام و نہاد اسلامی رسم و رواج کے بارے میں شبہ کرنے لگیں گے، اس قسم کے مذہب میں نہ صرف ان کی دلچسپی کم ہوتی جائے گی بلکہ بالآخر وہ اس کی طرف سے بالکل منہ موڑ لیں گے۔ یہاں یہ بات اور کہی جا سکتی ہے کہ اس میں خود مذہب کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ یہ ان مشتبہ قسم کے عمومی تصورات کا نتیجہ ہے جنھوں نے اسلام کے روشن چہرے کو چھپا لیا ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ اسلام کی مرضی کے خلاف غلط تصورات نے خود کو اس سے وابستہ کر لیا ہے[13]۔

ان کے لفظوں میں اس آزمائشی حل کا دوسرا حصہ یعنی 'مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان میل محبت پیدا کرنا'[14] بھی مغربی تعلیم حاصل کرنے سے بڑی اطمینان بخش حد تک حاصل کیا جا سکتا تھا۔ سر جان اسٹریچی نے بھی 1880 میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت اپنی جوابی تقریر میں سرسید سے اتفاق کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا: 'آخری اور سب سے بڑا کام جس پر سرسید نے اپنا وقت اور وسائل صرف کیے' اپنے ہم مذہبوں کی تعلیم و ترقی کی کوشش کرنا نیز ان کے اور انگریز حضرات کے درمیان اتحاد اور ہمدردی پیدا کرنا تھا'[15]۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ خیال تقویت پاتا گیا کہ 'مسلمانوں کو عزت و وقار کا مقام' دلانے کے مقصد کے حصول کا اصل راستہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ہے۔ محسن الملک کے الفاظ میں: 'انھوں نے (سرسید نے) پہلے وہ وسائل دریافت کرنے کی کوشش کی جن سے مسلمانوں کی عزت اور وقار بحال ہو سکتے تھے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ تعلیم ہی وہ وسیلہ ہے تو پھر انھوں نے اس راہ کی رکاوٹیں تلاش کیں۔ انھوں نے مسلمانوں سے سوال کیے، اور مختلف صوبہ جات سے جواب حاصل کر کے اور ان کی معقولیت پر یقین کر کے، ایک انجمن قائم کی تا کہ رکاوٹوں پر بحث کی جائے اور ان کو دور کرنے کی تدابیر پر غور کیا جائے، سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اعلیٰ تعلیم کا ایک ادارہ قائم کیا جائے'[16]۔

اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سرسید اور ان کے ہم خیال اشخاص اس بات سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد سے ملک میں ایک عظیم سماجی تبدیلی آ چکی تھی، اس تبدیلی کے تئیں مسلمانوں کا ردِ عمل اگر مثبت نہ ہوا تو انھیں خاصہ بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اگر مسلمانوں نے اس تبدیلی کو اپنے موافق کرنے کے لئے سخت جدوجہد نہ کی تو جو نقصان ہوگا اس کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہوگا۔ یہ سخت جدوجہد صرف اسلامی علم و فضل اور مغربی تعلیم کے ایک معقول مرکب کے ذریعے ہی کی جا سکتی تھی[17]۔

مسلم قوم میں جان ڈالنے کی واحد امید اس تبدیلی کو ان کے موافق بنانے میں پنہاں تھی، اور اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے کوئی بھی قیمت دی جا سکتی تھی۔ مسلمانوں کی تقدیر بدلنے کے جذبات سے سرشار ہو کر سرسید نے ساری توجہ اس مقصد کے حصول پر مرکوز کر دی، اور اس سمت میں کی جانے والی کوششوں کی اگر کسی نے مخالفت کی تو وہ خاطر میں نہ لائے۔ اس وقت کے سماجی اور سیاسی مسائل کی بابت ان کے موقف کو اسی مقصد سے جذباتی وابستگی کی روشنی میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے 'مسلمانوں کی عزت و وقار کے مقام کی بابت ان کے مقصد کی ٹھوس شکل ایک کالج کے قیام پر منتج ہوئی۔ سر جان اسٹریچی کو خطاب کرتے وقت یہ بات واضح ہوئی۔ خطاب یوں ہے 'ہمیں پورا یقین ہے کہ برطانوی حکومت کے تحت کامیابی کا واحد راستہ تعلیم ہے۔ وہ اسکیم جس کے تحت کالج قائم ہوا اس تحریک کا حصہ ہے جو پچھلے چند برسوں سے برابر قوت حاصل کر رہی ہے، اور ہمیں یقین ہے کہ یہ تحریک ہماری قومی حیثیت پر اس سے کہیں زیادہ اثر ڈالے گی جتنی اولاً سمجھی گئی تھی'[18]۔

اس کے بعد سے سرسید کی خاص مصروفیت علی گڑھ کالج کا قیام تھی۔ اور 'مقام عزت' والا مقصد ان مقاصد سے وابستہ ہو گیا تھا جن کے تحت کالج قائم ہوا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کالج کے مقاصد ان بڑے مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ہو رہے تھے جیسے 'مغربی تعلیم کے خلاف تعصبات کو دور کرنا اور انگریز حضرات کے ساتھ آزادی سے ملنے جلنے اور انھیں سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا'[19]۔

سر انٹونی میکڈانل کو 1844 میں خطاب کرتے وقت ان مقاصد کی طویل فہرست پیش کی گئی جن کے حصول کے لیے کالج قائم کیا گیا تھا۔ فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے:

'ان خیالی ریت رواج کے اثر کو زائل کرنا جنھوں نے ہماری ترقی میں روڑے اٹکائے ہیں، ان تعصبات کو دور کرنا جو اب تک ہماری نسل پر اپنے منحوس سائے ڈالتے رہے ہیں، مشرقی علوم اور مغربی ادب میں مفاہمت پیدا کرنا، مشرق کے لوگوں کے خواب آلودہ دماغوں میں اس قوتِ عمل کو ابھارنا جو مغرب کے لوگوں کا حصہ ہے، مسلمانانِ ہند کو تاجِ برطانیہ کی لائق اور مفید رعایا بنانا، ان میں ایسی وفاداری پیدا کرنا جو بدیسی حکومت کی غلامانہ اطاعت پر نہیں بلکہ اچھی حکومت کی برکات کی صحیح قدردانی پر مبنی ہو.....'[20]۔

مسلم ایجوکیشن کانگریس جو بعد میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کہلائی تاکہ اسے انڈین نیشنل

کانگریس [21] سے خلط ملط نہ کر دیا جائے، اس کے عام اور خاص مقاصد [22] بھی اسی انداز کے تھے۔

عام اور خاص مقاصد کی بحث کا خلاصہ اس طرح کیا جاسکتا ہے: 'عزت و وقار کا مقام' تعصبات کو بے اثر بنا کر اور یورپین علوم سیکھ کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک کالج کا قیام جو تحریک کا مرکز ہو، جو نئی پود لگانے کا باغ ہو، ایک ایسی مثال ہو دوسرے جس کی تقلید کریں، اس مقصد کے حصول کے لیے اشد ضروری ہے۔ اس لیے ساری امیدیں کالج کے قیام سے وابستہ کر دی گئیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور تحریک کے بانیوں کے خیالات واضح ہوتے گئے، ان کا سارا زور ایم اے او، کالج کے قیام پر صرف ہونے لگا، اور کالج مسلمانوں کی سماجی اصلاح، نیز انگریزوں سے اچھے تعلقات کی علامت بن گیا۔ ان دونوں باتوں نے مسلمانوں کو ترقی کے لیے ترغیب دلائی اور ایسا ماحول بنایا جو اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری تھا تاکہ اس زمانے کے سماج میں بالآخر مسلمانوں کو عزت کا مقام حاصل ہو جائے۔

تاریخ

'لوگوں کو اس لائق بنانا کہ ان میں مغربی ادب اور علم و فضل کی قدر کرنے کا احساس پیدا ہو جائے نیز انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان دوستی اور ہم آہنگی کی بنیاد فراہم ہو جائے' [23]۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پہلا عملی قدم 1863 میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا۔ اس سوسائٹی نے قدیم ہندوستانی ادب کی بہترین کتابوں نیز کارآمد انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کرنے کی ذمہ داری لی تاکہ یورپین علوم کے فوائد عام ہو جائیں، اور ان تک ہندوستانیوں کی رسائی آسان ہو جائے۔ اسی سال غازی پور میں وکٹوریہ میموریل اسکول قائم ہوا جہاں انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت میں تعلیم دی جاتی تھی۔ مندرجہ بالا دو کام جو سرسید نے تقریباً ساتھ

ساتھ شروع کیے آئندہ ہونے والے کاموں کا گویا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

حالانکہ بعد میں سرسید نے اردو ترجموں کے ذریعے مغربی علوم کو رواج دینے کے اپنے فیصلے کو بدل دیا، لیکن وہ سوسائٹی کے دونوں مقاصد کے حصول کے لیے کاوش کرتے رہے، یعنی (ا) لوگوں کے دلوں میں مغربی علوم کی قدر کرنا، اور (ب) ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان اچھے تعلقات قائم کرنا۔ اسی طرح، اسکول قائم کرنے کا تجربہ انھیں پہلی بار غازی پور میں ہوا، جس کا فائدہ علی گڑھ کالج قائم کرتے وقت ضرور ہوا ہوگا۔ اپنی مدد آپ کا جو اصول غازی پور اسکول بناتے وقت اپنایا گیا، وہ بعد میں علی گڑھ کالج کے بانی کے خوب کام آیا۔

1864 میں سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت علی گڑھ میں بن کر تیار ہوگئی، جہاں 1866 میں ایک سیاسی تنظیم برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا افتتاح ہوا۔ اس کا مقصد 'ہندوستانی معاملات کے بارے میں لوگوں کے جذبات اور خواہشات کو برطانوی پارلیمان کے ممبران تک پہنچانا تھا'[24]۔

ایک اسی طرح کی تنظیم برطانیہ میں مقیم ہندوستانیوں نے بنائی، جس کے بارے میں خیال تھا کہ برطانوی پارلیمان تک خبریں پہنچانے کا ذریعہ بن سکے گی۔ علی گڑھ کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن اس وقت تک کام کرتی رہی جب تک کہ 1867 میں سرسید کا تبالہ بنارس نہ ہوگیا۔

1866 میں سائنٹفک سوسائٹی کا رسالہ علی گڑھ گزٹ جاری ہوا۔ اس نے ایسے مضامین چھاپ کر جن سے دونوں طرح کے لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل ہو، انگریزوں اور ہندوستانیوں کو قریب لانے میں نمایاں خدمت انجام دی[25]

1867 میں سرسید نے شمال مغربی صوبہ جات میں دیسی زبان کی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز رکھی۔ اس تجویز پر سرکار نے یہ عندیہ دیا کہ کلکتہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم انگریزی کے بجائے دیسی زبان کردی جائے۔ سرسید نے وضاحت کی کہ وہ یہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ 'تعلیم میں انگریزی زبان کا رول کم ہوجائے ..... بلکہ وہ تو ان زائد فوائد میں دلچسپی رکھتے تھے جو اپنی زبان

میں تعلیم حاصل کر کے بہت سے ہندوستانیوں کو حاصل ہو جاتے'[26]۔

اس مسئلے پر سرسید نے اپنے موقف کی وضاحت اور زیادہ صاف لفظوں میں اس خط میں کی جو انھوں نے سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی کو بھیجا۔ انھوں نے یہ خط 1869 میں لندن سے بھیجا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ 'انگلستان کی تہذیب کا سبب یہ ہے کہ تمام فنون اور سائنس ملک کی زبان میں ہیں۔ حالانکہ انگلستان کے کچھ حصوں میں انگریزی ایسے لہجے میں اور ایسے تلفظ کے ساتھ بولی جاتی ہے کہ اسے سمجھنا مشکل ہوتا ہے، لیکن بحیثیتِ مجموعی انگریزی شمال مغربی صوبہ جات اور بہار کی اردو کی مانند ہے جسے ہر شخص سمجھتا ہے۔ جو لوگ حقیقتاً ہندوستان کی ترقی اور بہتری کے خواہاں ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی واحد تدبیر یہ ہے کہ سارے فنون اور سائنس کا ترجمہ اپنی زبان میں کر لیں'[27]۔

دیسی زبان کی یونیورسٹی کی تجویز پیش کرنے اور پھر اسے واپس لینے میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے وہ عوام الناس کی تعلیم کی بابت ان کے خیالات کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے[28]۔ کیونکہ تعلیم کو عام کرنے کے معاملے میں وہ پوری طور سے دیسی زبان استعمال کرنے کے حق میں تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ انھیں یہ بھی یقین تھا کہ '.....علم کی کسی بھی شاخ میں کسی ملک نے اس وقت تک ترقی نہیں کی جب تک علم کی اس شاخ کو ملک پر حاوی زبان کے ذریعے نہیں پڑھا گیا۔ ہندوستان پر حاوی زبان انگریزی ہے دیسی نہیں'[29]۔ 'حاوی زبان' سے ان کا مطلب حاکم قوم کی زبان تھی۔ اور چونکہ انگریز نہ صرف ہندوستان کی حاکم قوم تھے بلکہ وہ ایک اونچے درجے کی تہذیب کی نمائندگی بھی کرتے تھے، اس لیے انھوں نے جس تعلیم سے متعارف کرایا تھا اسے اگر انہی کی زبان یعنی انگریزی کے ذریعے حاصل کیا گیا تو کہیں زیادہ فائدہ ہو سکتا تھا۔

اس لیے یہ سوچنا حق بجانب ہے کہ سرسید کا ایک قلیل مدتی اور ایک طویل مدتی پروگرام تھا۔ اول الذکر پروگرام کے مطابق مغربی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعے ہونی تھی، اور آخر الذکر

صورت میں مغربی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے دی جاتی تھی۔ اول الذکر تعلیم کے فارغ شدگان اس تعلیمی تحریک کا قلب ثابت ہوں گے جو تعلیمی تحریک آخر الذکر تعلیم کی مدد سے عوام کو اپنے دائرے میں لے لے گی۔ مغربی تعلیم، جدید تہذیب کے فوائد عام لوگوں تک صرف دیسی زبان کے ذریعے ہی پہنچا سکتی تھی۔ اگر انھوں نے اس طرح نہ سوچا ہوتا تو یہ بیان ان سے منسوب کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں۔ 'جب حکمرانوں کی زبان ملکی زبان نہ ہو تو کوئی اپنی زبان نہیں سیکھتا، کیونکہ اب تک تو دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ کوئی بھی محض حصولِ علم کے لیے نہیں پڑھتا، سب حصولِ روزگار کے لیے پڑھتے ہیں۔ اے ہندوستان کا بھلا چاہنے والو، کسی کا سہارا نہ ڈھونڈو، نظر کو وسعت دو، خود پر، اپنے چندوں، علوم وفنون کے اپنے ترجموں پر اعتماد رکھو، اور پھر جب تم نے ان پر قدرت حاصل کر لی اور تہذیب یافتہ ہو گئے، تو سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے بارے میں تم شاذ ہی سوچو گے۔ مجھے امید ہے اور اعتماد ہے کہ وہ دن جلد ہی آئے گا'[30]۔

انگلستان میں سترہ (17) مہینے (11 اپریل 1869 تا 12 اکتوبر 1870) کے قیام کے دوران سرسید کو انگریزی تہذیب قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اس سے خاصے متاثر ہوئے۔ لیکن پختہ ذہن ہونے کے سبب انھوں نے برطانوی لوگوں کو تہذیب کے اس اونچے معیار تک پہنچ جانے کے اسباب جاننے کی کوشش کی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ درست تعلیم کے ذریعے ہی وہ تبدیلی آئی ہے جس کی بنا پر انگلستان کے عام لوگ ہندوستانیوں سے افضل لگتے ہیں[13]۔

لندن میں سرسید کی سرگرمیاں مسلمانوں کو عیسائیوں کے قریب لانے کے مستقل مقاصد کے حصول کے خاطر تھیں، نیز مسلمانوں پر اس مہذب دنیا کے دروازے کھولنے کی خاطر تھیں جس تک رسائی مغربی تعلیم کے ذریعے ممکن تھی۔ ان کی خاص مصروفیت خطبات احمدیہ لکھنا تھی۔ یہ مضامین کا مجموعہ ہے جن کو لکھنے کا مقصد اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں دور کرنا تھا۔

انھوں نے بڑے غور سے برطانوی نظامِ تعلیم کا مطالعہ کیا، ہندوستان میں مروج نظامِ تعلیم سے اس کا مقابلہ کیا، اور 'موجودہ نظامِ تعلیم پر سخت تنقید' کے عنوان سے ہندوستانی نظامِ تعلیم پر تنقیدی مضمون لکھا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے دورے نے ان کے دماغ پر ایک مستقل نقش چھوڑ دیا۔ کیمبرج یونیورسٹی علی گڑھ کالج کے لئے نمونہ بن گئی۔

اس طرح دورۂ انگلستان نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں ان کی سرگرمیوں پر یقیناً تازیانے کا کام کیا۔ وہ 2 اکتوبر 1870 کو انگلستان سے واپس ہوئے، اور 26 دسمبر 1870 کو خواستگارانِ ترقی و تعلیمِ مسلماناں کمیٹی تشکیل دی گئی۔ کمیٹی کا مقصد ان اسباب کو تلاش کرنا تھا جن کی بنا پر مغربی تعلیم کے تئیں مسلمانوں کا ردِ عمل مثبت نہیں تھا، خصوصاً اس صورت میں جب ان میں روایتی تعلیم کی مقبولیت کا رجحان بھی برابر زوال پذیر تھا۔ کمیٹی نے متذکرہ بالا عنوان پر مضامین لکھنے کی پیش کش کی۔ بتیس (32) مضامین وصول ہوئے۔ ان مضامین میں جو نکات ابھر کر سامنے آئے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

1۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کے بارے میں پرانے انداز کے مسلمانوں کے شکوک و خطرات خود ان کی اپنی قوم کے لئے نقصان دہ اور حماقت آمیز ہیں۔

2۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبا کی تعداد ہندو طلبا کے مقابلے میں اس سے بہت کم ہے جتنی ہونی چاہیے تھی۔

3۔ سرکاری اسکول میں اپنے بچوں کو پڑھانے میں بہت سے مسلمانوں کے اعتراضات بعض اوقات بے بنیاد تو ہیں لیکن اس بنا پر حق بجانب ہیں کہ جس طرح کی تعلیم دی جاتی ہے وہ عام طور سے مسلمانوں کی ضروریات علمی بہم پہنچانے میں ناکام رہتی ہے۔

4۔ اگر سرکار مسلمانوں کے فائدے کے خیال سے نظامِ تعلیم میں کچھ تبدیلیاں بھی کردے

تو بھی ان کی ساری ضروریاتِ علمی پوری نہیں ہوسکتیں۔

5۔ وہ واحد طریقہ، جس کے ذریعے مسلمان اپنے روایتی انداز کے علوم کو باقی رکھ سکتے ہیں، جدید طریقوں سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں اور اپنی ضروریات کے مطابق اپنے بچوں کو تعلیم دے سکتے ہیں، یہ ہے کہ اپنی تعلیم کے لیے خود انتظامات کریں۔ 32

اس پر غور کیجیے کہ متذکرہ بالا سارے نکات ایک ایسے ادارے کے قیام کے حق میں معلوم ہوتے ہیں جو نہ سرکاری ادارہ ہو اور نہ روایتی مدرسہ بلکہ ایک ایسا ادارہ ہو جیسا 5 نمبر کی مد میں دیا گیا ہے۔

اس کمیٹی کی رپورٹ اور ایک اینگلو اورینٹل کالج کے قیام کی تجویز ہندوستان کی سرکار اور مقامی سرکاروں کو بھیجی گئی۔ اس کا بڑا امید افزا جواب آیا۔ لیکن سب سے زیادہ ہمت افزا جواب خود مسلمانوں کی طرف سے آیا۔ مسلمانوں کے جواب نے وہ قوتِ محرکہ فراہم کی جو کسی منصوبے پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

خواستگاران ترقی و تعلیم مسلماناں کمیٹی اپریل 1872 میں بدل کر فنڈ کمیٹی یعنی خزینۃ الاعانۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین بن گئی، اور رجسٹر ہوگئی تاکہ جائداد اور درشنی ہنڈی یا پرومیزری سکریٹری کی ذاتی ملکیت نہ بن سکیں۔

فنڈ کمیٹی نے، مقامی سرکاروں نے، ہندوستان کی سرکار نیز علما نے تعلیم کے جس منصوبے کو نافذ کرنا منظور کیا وہ سید محمود نے برطانوی نظامِ تعلیم کی بنیاد پر تیار کیا تھا۔ لیکن بعض لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی جن میں سب سے زیادہ نمایاں کانپور کے ڈپٹی کلکٹر امداد علی اور گورکھپور کے سب جج مولوی علی بخش خاں تھے۔

سید محمود نے کیمبرج یونیورسٹی کے نمونے پر منصوبہ بنایا تھا۔ انھوں نے کالج نہیں یونیورسٹی کی تصویر ذہن میں رکھی تھی اور اسے مدرسۃ العلوم کا نام دیا تھا۔ منصوبہ خاصہ سادہ تھا۔ اس

میں پانچ سال اسکول کے، دو سال انٹرمیڈیٹ کے، دو سال بی اے کے، اور دو سال ایم اے کے رکھے گئے تھے۔ اس کی خوبی وہ تفصیلات تھیں جو عملے کی تنخواہوں، انتظامی تنظیم، وظائف کی ادائیگی وغیرہ کی بابت حساب لگا کر درج کی گئی تھیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ 24 مئی 1875 کو ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے موقع پر اسکول کا افتتاح ہوا کالج کا نہیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں نے، جو اس وقت فنڈ کمیٹی کے سکریٹری تھے، اسکول کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اسکول نے یکم جون 1875 سے کام شروع کیا۔ جارج اہی سیڈون، جو اوکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے، اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اسکول کے دو سال بعد کالج نے کام شروع کیا۔

کالج کا سنگِ بنیاد، جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج رکھا گیا، 8 جنوری 1877 کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ لارڈ لٹن نے رکھا، جو ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل تھے۔ یہ پتھر اسٹریچی ہال کے درمیانی دروازے کے دائیں طرف لگا دیا گیا ہے۔ اس ہال کی بابت سرسید کا خیال تھا کہ ایک مرکزی عمارت ہوگی، جس میں ممتاز مہمانوں کا استقبال کیا جائے گا اور جلسہ ہائے مشاورت ہوا کریں گے[33]۔ اس ہال کا نام لیفٹیننٹ گورنر، سرجان اسٹریچی کے نام پر رکھا گیا تھا جنھوں نے کالج کے لیے وہ 74 بیگھہ زمین ذمہ دارانِ کالج کے حوالے کرنے کے احکامات صادر کیے تھے جس کی یافت کے سلسلے میں ضلع کے حکام نے کچھ مسائل پیدا کر دیئے تھے۔

بانیانِ کالج میں سے کچھ اشخاص کالج کی عمارتوں کی تعمیر پر بڑی بڑی رقومات صرف کرنے کے قائل نہیں تھے، لیکن سرسید کو یقین تھا کہ کالج کی مکمل کامیابی بلکہ اس کا وجود تک اس پر منحصر تھا کہ جہاں تک ہو سکے نہایت عالیشان عمارتیں بنوائی جائیں[34]۔ آثار الصنادید کا مصنف خوب اچھی طرح واقف تھا کہ عمارتیں انسانی ذہن پر کیسے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ سرسید خود ہی عمارتوں کے نقشہ نویس اور نگراں بن گئے۔ انھوں نے اس چوکور احاطے کا نقشہ بنایا جس میں

مرکزی ہال، مسجد، رہائش اور تدریس کے کمرے، کھانے کا ہال اور تدریس وقیام سے متعلق ساری ضروری عمارتیں تھیں۔ عمارتیں لوگوں کے عطیات سے بنی تھیں۔ بعض اوقات عمارت کا نام عطیہ کنندہ کے نام پر اس توقع پر رکھا گیا کہ وہ اور بڑی رقم دے گا۔ نواب حیدرآباد اور وہاں کے ممتاز وزرا کے نام پر نظام میوزیم، آسمان منزل اور سالار منزل نام رکھے گئے۔

کالج کی عمارات تعمیر کرنے کے پروگرام میں لوگوں کو شمولیت کی طرف مائل کرنے کا ایک مستقل طریقہ یہ تھا کہ پتھر کی چار دیواری پر، کمروں پر، اسٹریچی ہال میں، عطیہ کنندگان کی رقومات کے لحاظ سے ان کے ناموں کی لوح نصب کی جائیں۔ بہرحال، جیسی کہ امید بھی تھی، چوکور احاطے میں مجوزہ ساری عمارتیں بنوانے کے پُرامنگ منصوبے کو مکمل ہونے میں بڑا وقت لگا۔ 1898 میں جب سرسید کا انتقال ہوا تو موجودہ یونیورسٹی کی مسجد میں دائیں طرف انھیں دفن کیا گیا۔ اس وقت مسجد کے نام سے صرف ایک چبوترہ تھا[35]۔ چوکور احاطے کے تین دروازے مولوی سید مہدی (نواب محسن الملک)، وکیل سید ظہیر حسین اور پہاسو کے نواب فیض علی خاں نے بنوائے۔ 1883 تک کالج کی چہار دیواری، تین دروازے اور متعدد کمرے بن گئے تھے اور بہت سی عمارتوں کی بنیادیں کھد گئی تھیں۔

پُروقار اسٹریچی ہال کی تعمیر 24 اپریل 1885 کو شروع ہوئی تھی۔ 12 نومبر 1894 کو مکمل ہونے کے بعد اس کا افتتاح ہوا۔ 1901 اور 1906 کے درمیان کالج کی بہت سی عمارتیں تیار ہوگئی تھیں۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں: ڈینٹن کورٹ (بعد میں موریسن کورٹ)، میکڈانل ہوسٹل، آسمان منزل، نظام میوزیم اور برکت علی خاں لیکچر روم۔ 1916 تک اور بھی کئی عمارتیں تیار ہوگئیں۔ ان کے نام یہ ہیں: بیک منزل، آرنالڈ ہاؤس، رام پور حامد ہال (یونین کی عمارت)، منٹو سرکل کے چار بلاک اور کالج کی مسجد۔ چوکور احاطے کا وہ پُرامنگ منصوبہ جس میں متعدد عمارتیں اور ساری ضروری چیزیں شامل تھیں سرسید کے انتقال کے بعد کی دو دہائیوں میں تقریباً مکمل ہوگیا۔

نصابِ تعلیم

سرسید نے مسلمانوں کو تعلیم دینے کا منصوبہ اپنے مضمون 'ترقی تعلیم مسلمانان' 36ء میں بڑی تفصیل سے پیش کیا تھا۔ یہ منصوبہ یقیناً سید محمود سے مشورہ کر کے تیار کیا گیا ہوگا، کیونکہ سید محمود نے اس سلسلے میں سرسید کو بہت متاثر کیا تھا۔ منصوبے کے مطابق اس تعلیمی نظام میں ایم، اے، او، کالج کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی، جس تعلیمی نظام نے ہر اس گاؤں اور قصبے کا احاطہ کر لیا ہوتا جہاں معقول تعداد میں مسلمان رہ رہے ہوتے۔ ایم، اے، او، کالج کے متعلق خیال تھا کہ وہ جلد ہی یونیورسٹی بن جائے گا، اور پھر مدرسۃ العلوم کہلائے گا۔ مدرسۃ العلوم کے انھوں نے تین کالج تجویز کیے تھے۔ ایک انگریزی کے لیے، دوسرا اردو کے لیے اور تیسرا عربی اور فارسی کے لیے۔

ان کی تجویز تھی کہ انگریزی کالج میں سارے جدید مضامین انگریزی زبان میں پڑھائے جائیں۔ لیکن لاطینی زبان طلبا کے لیے لازمی ہو، اور دوسری زبان کے طور پر وہ اردو یا فارسی یا عربی لیں۔ اس کے علاوہ اس کالج کا ہر طالب علم فقہ اسلامی، حدیث اور اسلامی اصولوں پر مختصر کتابیں اردو میں پڑھے۔ ان کے مطابق یہ کالج دو مقاصد حاصل کر سکتا تھا۔ پہلا یہ کہ جو طلبا سرکاری ملازمت حاصل کرنا چاہیں گے انھیں اس کا موقع مل جائے گا۔ دوسرا یہ کہ کالج سے ایسے عالم فاضل طلبا نکلیں گے جن کی انگریزی زبان کی لیاقت نہایت عمدہ ہوگی، اور جو انگریزی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کرنے کے اہل ہوں گے۔ یہ عالم فاضل لوگ جدید علوم کو ہندوستان کے عوام میں عام کر سکیں گے۔

ان کی تجویز کے مطابق دوسرے کالج میں سارے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے۔ اس کے علاوہ اس کالج کے ہر طالب علم کو عربی، فارسی یا انگریزی میں سے دوسری زبان کے طور پر ایک زبان لینا لازمی ہوتا۔ ان کے خیال میں اس کالج میں جو طلبا دس یا بارہ سال کی عمر میں داخلہ لیتے وہ اٹھارہ (18) سال کی عمر تک جدید مضامین کا علم بی، اے، کی سطح تک حاصل کر لیتے۔ اور ان

کا دوسری زبان کا علم انٹرنس کی سطح کا ہو جاتا۔ دوسری زبان کو مزید تین سال پڑھنے کے بعد اس زبان پر ان کی گرفت اتنی اچھی ہو جاتی کہ سرکاری ملازمت حاصل کر سکتے۔ یا پھر فارسی یا عربی ادب میں فضیلت حاصل کر لیتے۔ ظاہر ہے کہ پہلی ترجیح ان طلبا کو دی جاتی جو انگریزی کو دوسری زبان کے طور پر لینا چاہتے۔

ان کا مجوزہ تیسرا کالج فارسی اور عربی ادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے تھا۔ ان کی رائے میں یہ کالج ان طلبا کے لیے ہوتا جو جدید علوم کی تعلیم اردو زبان میں حاصل کر کے فارسی یا عربی ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

ان کالجوں کا وجود چونکہ علاحدہ نہ ہوتا بلکہ یہ ایک دوسرے پر منحصر ہوتے، اس لیے یہ سب مل کر ایک ہی کالج کہلاتے۔

نصاب تعلیم کی بابت ان کی تجویز تھی کہ دو طرح کے نصاب ہوں، عمومی اور خصوصی۔ [37]

عمومی نصاب مندرجہ ذیل ہونا چاہیے:

دینیات۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، علم سیرہ، علوم عقائد۔

ادب۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی، لاطینی، تاریخ، جغرافیہ، علم اخلاق،

علم ذہن یا علم عضویات، منطق، فلسفہ، اصول حکومت، سیاسی اقتصادیات۔

ریاضی۔ حساب، الجبرا، اعلیٰ ریاضی

طبیعیات۔ علم سکونیات، علم حرکیات، علم آب، ماحولیاتی سائنس، بجلی یا توانائی، نجوم، آواز، حرارت، فلسفۂ فطرت۔

علم کے مندرجہ ذیل دائروں میں مطالعہ کے لیے خصوصی نصابات پیش کرنے کی تجویز تھی:

انجینیرنگ، جانوروں کا علم عضویات، علم تشریح الابدان (اناٹومی)، علم حیوانات،

علمِ نباتات، علمِ ارضیات، علمِ معدنیات، علمِ کیمیا۔

مطالعے کے مندرجہ بالا نصابات کا ڈھانچہ بلاشبہ وہی تھا جو اس وقت کیمبرج یونیورسٹی میں رائج تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں مندرجہ ذیل نصابات رائج تھے[38]: مندرجہ ذیل عمومی نصاب جو ہر طالب علم کے لیے لازمی تھا:

لاطینی: یونیورسٹی کی تجویز شدہ کتاب۔

یونانی: یونیورسٹی کی تجویز شدہ کتاب۔

قواعد: لاطینی اور یونانی زبانوں کی

چار میں سے ایک انجیل جو اصل یونانی زبان میں ہو۔

ایک کتاب جو عیسائی مذہب کے حق میں دی جانے والی دلیلوں پر مبنی ہو۔

ریاضی: حساب، الجبرا، علمِ ہندسہ

خصوصی نصابات جن میں سے مطالعے کے لیے ہر طالب علم کو کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا:

علم کا پہلا دائرہ: ریاضی کی چھتیس (36) شاخیں جیسے نجوم، علمِ آب، کشش ثقل،

علم کا دوسرا دائرہ: لاطینی اور یونانی ادب بمعہ تاریخ روم اور یونان، اور عظیم شخصیات جیسے سقراط، ارسطو وغیرہ کی سوانح حیات

علم کا تیسرا دائرہ: علومِ اخلاقیات جن میں فلسفہ (اصولِ حکومت کے ساتھ)

علم کا چوتھا دائرہ: فطری علوم جن میں علمِ کیمیا، علمِ معدنیات، علمِ ارضیات، علمِ نباتیات، علمِ حیوانیات شامل ہوں۔

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں سے طالب علم کو صرف دو مضامین لینے ہوتے۔

علم کا پانچواں دائرہ: اس امتحان میں وہ طلبا شریک ہو سکتے جو کلیسا کے رکن بننا چاہتے ہوں۔ ان کے لیے عبرانی اور یونانی زبانیں جاننا ضروری ہوتا تاکہ وہ اصل

مذہبی متن پڑھ سکتے۔

علم کا چھٹا دائرہ: اصولِ قانون و تاریخ جس میں قانونِ روم شامل ہوتا کیونکہ یہی موجودہ یورپی قوانین، بین الاقوامی قانون اور تاریخِ قانون کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

علم کا ساتواں دائرہ: علمِ طب، مضامین کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ مطالعے کے واسطے سرسید کے مجوزہ نصاب اور کیمبرج یونیورسٹی کے مروجہ نصاب کا ڈھانچہ ضرور ایک تھا، لیکن نصابات بہت مختلف تھے۔ سرسید نے جو عمومی نصاب تجویز کیا اس کا رخ کیمبرج یونیورسٹی کے مروجہ عمومی نصاب کے مقابلے میں واضح طور پر سماجی علوم اور فطری علوم کی طرف تھا۔ ان کے خصوصی نصابات کُلّی طور پر سائنس اور ٹیکنولوجی کے نصاب تھے۔ یہ اس لیے تھا کیونکہ تین کالجوں والے منصوبے میں فارسی اور عربی کالج مہیا کیا گیا تھا جس میں طلبا اگر چاہتے تو عمومی نصاب پورا کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ اس لیے فارسی اور عربی کالج کے نصاب اور جو خصوصی نصابات سرسید نے تجویز کیے تھے، دونوں مل کر اس رجحان کے عکاس تھے جو کیمبرج یونیورسٹی میں رائج اس وقت کے خصوصی نصابات سے ظاہر ہوتا ہے۔

نہ تو سرسید نے اور نہ ہی سید محمود نے، جنھوں نے سرسید کو اس ضمن میں اس سے کہیں زیادہ متاثر کیا تھا جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے، اس بات کو راز رکھا کہ کیمبرج یونیورسٹی ہر طرح سے علی گڑھ کالج کے لیے نمونہ تھی۔ اپنے مجوزہ انگلش کالج کے نصابِ تعلیم کے سلسلے میں سرسید کا مشورہ تھا کہ وہ کتابیں استعمال کی جائیں جو کیمبرج اور آکسفورڈ میں رائج تھیں [39]۔ ان کا کہنا تھا کہ انھی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کر کے اردو کالج میں استعمال کی جائیں۔ سید محمود نے بھی کالجوں میں اردو تراجم استعمال کرنا تجویز کیا [40]۔

1877 میں کالج قائم ہوا، اور اس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج رکھا گیا۔ اس میں

انگریزی اور مشرقی شعبے تھے۔ اول الذکر میں ذریعۂ تعلیم انگریزی اور آخر الذکر میں اردو تھا۔ لیکن مشرقی شعبے میں ادب، منطق اور فلسفہ کا ذریعۂ تعلیم فارسی اور عربی تھا۔ سرسید انگلستان سے کتابوں کی ایک فہرست لائے تھے جو اردو میں ترجمہ کر کے درسی کتابوں کی طرح استعمال کی جاسکتی تھیں۔ ترجمے کا کام مشرقی شعبے کے مطالبات پورے نہیں کر پا رہا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مولوی ذکاء اللہ نے صرف چند کتابیں اردو میں ترجمہ کی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا جب الہ آباد میں دیسی زبان کے امتحان میں شریک ہوئے، جو کلکتہ کے میٹرک امتحان کے برابر سمجھا جاتا تھا، اور جس برابری کو دیسی زبان کی تحریک کے جواب میں سرکار نے 1874 میں منظور کر لیا تھا، تو صرف ایک طالب علم پاس ہوا۔ مشرقی شعبے میں طلبا کی تعداد کم ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ 1885 میں شعبہ ہی بند ہو گیا۔

مشرقی شعبے کی ناکامی کا جزوی سبب کالج کے معاملات میں ان لوگوں کا حاوی ہونا تھا جو انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کے طرف دار تھے [41]۔ اور دوسرا جزوی سبب یہ تھا کہ سماجی علوم، فطری علوم اور ریاضی میں استعمال ہونے والا طریقۂ بیان اور ذخیرۂ الفاظ طلبا کو سکھایا نہ جاسکا۔ 1882 کے ایجوکیشن کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے سرسید نے خود اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ 'جب تک ہماری قوم انگریزی تعلیم کے خیال کی درست ادائیگی سے واقف نہیں ہو جاتی اور اظہارِ خیال میں ڈھیلے پن کو بھول نہیں جاتی اس وقت تک ہماری زبان اعلیٰ قسم کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ نہیں بن سکتی' [42]۔

فطری علوم، سماجی علوم اور ریاضی کے مطالعے کے واسطے جس طرح کے اظہارِ بیان اور ذخیرۂ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے ان کے نہ ہونے کی ساری ذمہ داری زبان پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ زبان اس سماج اور تہذیب کے خیال، احساس یا عمل کا ذریعہ ہوتی ہے جو اسے جنم دیتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں انیسویں صدی کے درمیانی دور کے زوال پذیر سماج نے اردو زبان کے پُر زور دھارے کو شاعرانہ مبالغہ آمیزی کی سمت موڑ دیا تھا، اور اس طرح اس زمانے میں آزاد خیال فنون

(لبرل آرٹ) اور مادی علوم کی زبان بننے سے روک دیا تھا۔

اس کے برخلاف انگریزی شعبہ خوب پھلا پھولا، اور اس نے کالج کی تقریباً ساری تعلیمی سرگرمیوں کا احاطہ کرلیا۔ انگریزی سوائے عربی، فارسی، سنسکرت اور دینیات کے سارے مضامین کا ذریعہ تعلیم بن گئی۔ کالج میں جو پہلا نصابِ تعلیم شروع کیا گیا وہ مندرجہ ذیل تھا:

1۔ زبانیں: انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت

2۔ اخلاقی علوم: منطق، فنِ خطابت، ذہن اور اخلاق سے متعلق فلسفہ اور تاریخ کے اصول وقواعد۔

3۔ فلسفہ مطابق فطرت، ریاضی، طبعی علوم

4۔ مسلم قانون، فقہ اور دینیات [43]۔

بی اے میں جو مضامین پڑھائے جاتے وہ ذیل میں دیے گئے ہیں: انگریزی، سیاسی اقتصادیات، تاریخ، ریاضی، فارسی، عربی اور سنسکرت [44]۔

علی گڑھ کالج میں جو نصاباتِ تعلیم پڑھائے گئے وہ یا تو کلکتہ یونیورسٹی سے منظور شدہ تھے یا الٰہ آباد یونیورسٹی سے۔ انٹرنس، ایف اے، بی اے، ایم اے اور ایل ایل بی کے جو نصاباتِ تعلیم انیسویں صدی کے آخر تک کالج میں بتدریج رائج ہوئے ان کو پہلی یا دوسری یونیورسٹی کی منظوری حاصل تھی۔ علی گڑھ چونکہ الحاقی کالج تھا اس لیے اسے نصابِ تعلیم میں تبدیلی کرنے کی یا تو گنجائش ہی نہ ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی تھی تو بہت معمولی سی۔

دینیات کے نصابِ تعلیم تیار کرنے اور پڑھانے کے سلسلے میں البتہ کالج پوری طرح خود مختار تھا۔ سرسید نے اپنے خط میں مجلس خزینۃ البضاعۃ کے ارکان سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ دینیات کا نصابِ تعلیم تیار کریں جو اسکول کے طلبا دوسرے مضامین کے ساتھ لازمی طور پر پڑھیں گے [45]۔ یہ نصاباتِ تعلیم ان طلبا کے لیے عربی اور فارسی میں ہوں جو یہ زبانیں پڑھنا چاہیں

گے۔ جو طلبا یورپی زبانیں پڑھنا چاہیں گے ان کا اسی جیسا نصابِ تعلیم اردو میں ہو۔ چونکہ اسکول کے ان پانچ سالوں میں سے کچھ سال عربی یا فارسی سیکھنے میں صرف ہوتے، اس لیے مجلس سے کہا گیا تھا کہ وہ نام لے کر بتائے کہ کس جماعت تک زبان کی تعلیم ہوگی جس کے بعد دینیات کی تعلیم شروع ہوگی۔

اسی طرح کی تجویز کالج کی سطح پر بھی پیش کی گئی۔ طلبا کو دوسرے مضامین کے ساتھ دینیات کا نصابِ تعلیم لازماً پڑھنا تھا۔ اس کام کے لیے مترجموں اور مصنفوں کی مدد سے فارسی اور اردو میں نصابِ تعلیم تیار کرانے کی تجویز تھی۔ اس کے علاوہ وہ چاہتے تھے کہ ارکانِ مجلس اسکول اور کالج کے ان طلبا کے لیے عربی کا ایک مکمل نصابِ تعلیم تیار کریں جو صرف دینیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

سرسید کی رائے میں دینیات کے تحت یہ مضامین پڑھائے جانے تھے: فقہ، حدیث، تفسیر، اصولِ فقہ، اصولِ حدیث، اصولِ تفسیر، علمِ عقائد، علمِ کلام[46]۔ کتابوں کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ رائج الوقت طریقے، یعنی کتابوں کے اقتباسات پڑھانے کے بجائے جلالین جیسی مفید کتاب پوری پڑھائی جائے۔ دوسری معیاری کتابوں، جیسے ہدایہ، بخاری، مسلم، بیضاوی کے مفید مطلب اقتباسات پر مبنی تلخیص پڑھانی چاہیے۔[47]

اس زمانے میں درسِ نظامی مدارس میں رائج تھا۔ اس پر ان کی تنقید سے سب لوگ واقف ہیں۔ انھوں نے نیا نصابِ تعلیم تیار کرنے پر زور دیا جس کا مقصد فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کے علم میں اضافہ کرنے کے ساتھ عربی زبان بولنے میں مہارت پیدا کرنا ہو۔ وہ ان طویل اور بے ضرورت مباحثوں کے خلاف تھے جو عربی مدرسوں میں مذہبی تعلیمات کا خاصہ تھے۔

اصلاحِ نصاب کی جو حکمتِ عملی انھوں نے وضع کی تھی اس پر آنے والے برسوں میں برابر عمل ہوتا رہا۔ جب علی گڑھ ایک مکمل یونیورسٹی بن گیا، اور شیعہ اور سنّی دینیات کے علاحدہ شعبے

کھل گئے، بی اے (دینیات) ایم اے (دینیات)، پی ایچ ڈی (دینیات) کی ڈگریاں بالترتیب مُلّا، مولانا، اور عالم کے ناموں سے دی جانے لگیں [48]۔ اس وقت بھی اصلاح کا یہ رجحان نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس میں باقی رہا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ندوۃ العلماء جو بعد میں قائم ہوا اس کا اولین مقصد بھی عربی مدارس میں رائج نصاب تعلیم کی اصلاح کرنا تھا۔ اس لیے جس عمل کی ابتدا علی گڑھ سے ہوئی اس نے علما کو یہ سوچنے پر ضرور آمادہ کیا ہوگا کہ عربی مدرسوں کے نصاب تعلیم کی تشکیل نو کا کام جلد ہونا چاہیے۔

ایم اے او کالج کی خصوصیات

سارے الحاقی کالجوں کی طرح علی گڑھ نے بھی کوشش کی کہ وہ اچھی تعلیم کے لیے مشہور ہو جائے۔ صفحات 115 اور 116 پر جو جدول (ب) دی گئی ہے اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ کالج یہ شہرت حاصل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکا۔

یہ درست ہے کہ جدول (ب) میں انٹرنس اور انٹرمیڈیٹ امتحانات کے جو نتائج درج ہیں ان سے کسی نمایاں معیار کا پتہ نہیں لگتا۔ لیکن یہ بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ انٹرنس کے امتحان میں علی گڑھ کا پاس فیصد یونیورسٹی کے پاس فیصد سے عام طور پر بہتر تھا۔ ایف۔اے، کے امتحان میں علی گڑھ کالج کا پاس فیصد یونیورسٹی کے پاس فیصد سے تھوڑا کم تھا۔ بی۔اے، کے امتحان میں علی گڑھ کے طلبا کی کارگزاری یونیورسٹی کے طلبا کے مقابلے میں ہمیشہ بہتر رہی۔ اور یہی بات ایم اے اور ایل ایل بی امتحانات کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ بیس سال کے عرصہ میں مختلف امتحانات میں علی گڑھ کالج کے طلبا کی کارکردگی کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کالج کا تعلیمی معیار خاصہ اچھا تھا۔

اس کالج میں عمرانی علوم (Liberal Arts) پڑھائے جاتے تھے، سائنس اور ٹیکنولوجی بہت بعد میں پڑھائے گئے۔

حالانکہ تدریس کے اعتبار سے یہ کبھی بھی اول درجے کا کالج نہ بن سکا، لیکن کالج کا علاقہ کھیل کود، تقریر وتحریر، حاضر جوابی، لطافت اور ظرافت سے بھرپور سماجی زندگی کا گہوارہ ضرور بن گیا۔

کرکٹ کلب پہلے پرنسپل ایچ، جی، آئی، سیڈون کے زمانے میں 1878 میں شروع کیا گیا۔ ٹیم کے پہلے کپتان شعبۂ ریاضی کے پروفیسر رام شنکر مشرا تھے۔ 1881 میں کالج نے تمام مقیم طلبا سے لازمی طور پر کرکٹ فیس لینے کی ایک ناکام کوشش کی۔

کالج کے دوسرے پرنسپل تھیوڈور بیک نے کھیلوں خصوصاً کرکٹ میں نئی جان ڈال دی۔ کرکٹ خوب مقبول ہوا، اور ٹیم پنجاب اور شمالی مغربی صوبہ جات کی بہترین ٹیم بن گئی[49]۔ کرکٹ ٹیم کو کامیاب بنانے میں پرنسپل بیک نے خاصہ جوش وخروش دکھایا۔ ان کے خیال میں اگر کالج کے نتائج بہت اچھے نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، دوسری چیزیں بھی توجہ طلب ہیں، کالج کی شہرت کا دارومدار بڑی حد تک ہماری کرکٹ اور فٹ بال کی ٹیموں کی کامیابی پر منحصر ہے[50]۔

کالج کے تیسرے پرنسپل تھیوڈور ماریسن نے فٹ بال شروع کروائی، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خود بھی فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔ وہ گھوڑ سواری کلب کے بھی بانی تھے، جس کا افتتاح 1893 میں کیا گیا۔ یہ سب 'مردانہ' کھیل تھے۔ ان کھیلوں نے کالج کو زمیندار صاحبان میں مقبول بنانے میں بڑی مدد دی۔

سرسید خود یہ چاہتے تھے کہ ان کے مجوزہ کالج میں ایک تقریری کلب قائم کیا جائے۔ 1880 میں ایسا کلب قائم کرنے کی ایک ناکام کوشش بھی کی گئی تھی[51]۔ بہرحال اگست 1884 میں کالج کے پہلے پرنسپل کے نام پر سیڈون کلب کا افتتاح ہوا۔ طے یہ کیا گیا کہ کالج کا پرنسپل کلب کا مستقل صدر اور سرسید خازن ہوں۔ صرف نائب صدر اور معتمد کا انتخاب طلبا خود کیا کریں۔

خازن سرسید، اور عہدے کی بنا پر بننے والے صدر، پرنسپل بیک تقریری مقابلوں میں

خود بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ بیک چاہتے تھے کہ سیاست پر تاریخی پس منظر کے ساتھ تحقیقی انداز میں بحث کی جائے۔ عصری سیاسی مسائل تقریروں کا موضوعِ بحث نہ بنائے جائیں، اور نہ ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کی بابت کلب کے پلیٹ فارم سے کوئی بحث کی جائے۔ اس معاملے میں ان کا رویہ اس قدر سخت تھا کہ انھوں نے طلبا کو پہلے سے خبردار کر دیا تھا کہ کسی تقریر نے اگر ذرا بھی 'باغیانہ' رخ اختیار کیا تو وہ مقرر کو فوراً روک دیں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ عصری سیاست کے معاملے میں اس سخت حکمتِ عملی کو سرسید کی مکمل تائید حاصل تھی، جو حکومت کی مخالفت سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نہ وہ اور نہ بیک یہ چاہتے تھے کہ تقریری مقابلے کا کلب سرکار مخالف جذبات کے اظہار کا پلیٹ فارم بن جائے۔

تقریری مقابلے، جو ہر بدھ کو ہوتے تھے، کبھی کبھی خاصے دلچسپ ہوتے تھے، جن میں لطافت اور ظرافت سے خوب کام لیا جاتا تھا۔ ایک ایسے ہی مقابلے میں جس کا محور بھوت پریت کا وجود تھا، سرسید نے مزاحیہ انداز میں کہا کہ انھوں نے لندن کے ایک تھیٹر میں ہیملٹ کے باپ کا بھوت دیکھا تھا[52]۔ ایک ایسے ہی تقریری مقابلے میں جو سبزی خوری کے فوائد اور نقصانات پر ہو رہا تھا، انگریزی کے پروفیسر ریلے نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ آدم اور حوا صرف بھنا گوشت کھاتے رہتے تو کبھی باغِ عدن سے نہ نکالے جاتے[53]۔

اس قسم کی لطافت کالج کی سماجی زندگی کا جُز بن گئی تھی۔ اس لطافت اور ظرافت کو، جو آج بھی یونیورسٹی کی سماجی زندگی میں جاری و ساری ہے، ہوسٹل کے مقیم طلبا نے اپنی دیر رات کی گپ شپ میں خوب پروان چڑھایا، تاکہ معمول کی بیزار کُن یکسانیت کو مزاح اور خوش طبعی سے دور کر کے زندگی کو ایک دوسرے کے لیے دلچسپ بنایا جائے۔

اسے شروع سے ہی ایک اقامتی کالج بنانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ سرسید اور سید محمود، جنھوں نے کالج کا خاکہ تیار کیا تھا، دونوں ہی پورے طور سے متفق تھے کہ اسے ایک اقامتی ادارہ

بنایا جائے تا کہ طلبا کی تربیت بہتر طریقے سے کی جاسکے۔ سرسید نے کبھی لکھا تھا کہ 'یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب تک ہمارے لڑکوں کی تربیت اس طرح (اقامت گاہ میں رکھ کر) نہیں کی جائے گی، اور انھیں ان کے گھروں سے دور نہیں رکھا جائے گا، وہ ہمیشہ برباد رہیں گے اور برابر بُری عادتوں کا شکار رہیں گے'[54]۔ سید محمود نے اسی موضوع پر اس طرح سے اظہارِ خیال کیا تھا کہ: 'طلبا کو اسی طرح تعلیم دینی چاہیے جیسے یونیورسٹی (کیمبرج یونیورسٹی) میں دی جاتی ہے۔ وہ کالج میں ساتھ ساتھ کھانا کھائیں اور رہیں۔ ہر طالب علم کو رہائش کے لئے دو کمرے ملنے چاہیے'[55]۔

اقامتی زندگی سرسید کے منصوبے سے خوب میل کھاتی تھی، جو آنے والی نسلوں کو اس اخلاقی انحطاط سے بچانا چاہتے تھے جو مسلمانوں میں گھر کر چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان لڑکے اپنی زندگی کا بیش قیمت وقت پتنگ بازی، مرغوں کی لڑائی وغیرہ میں ضائع کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکے وہی ذاتی نظم وضبط پیدا کریں جو 'یورپ کی مہذب قوموں' کی خصوصیت تھی۔ ان کی رائے میں ایک منصوبہ بند اقامتی زندگی ہی مسلمانوں کی نئی نسلوں کو مایوس کُن معاشرے کی زنجیروں سے آزاد کرا سکتی تھی۔

حالانکہ غیر اقامتی طلبا پر داخلے بند نہ تھے، لیکن غیر اقامتی طلبا کالج کی سرگرمیوں کے بارے میں شاذ و نادر ہی رائے دیتے تھے۔ اقامت گاہ کی زندگی پورے طور سے منصوبہ بند تھی۔ مولوی محمد اکبر جو کاندھلہ (یوپی) کے علما کے ایک معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے اپنی وفات 1886 تک اقامت گاہ کے نگراں رہے۔ اقامتی طلبا ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ انھوں نے اقامت گاہ کے ضوابط پورے طور سے نافذ کر دیے تھے۔ نماز اور کمرۂ طعام میں حاضری لازمی تھی۔ کوئی طالب علم 7 بجے شام سے 7 بجے صبح تک دوسرے طالب علم کے کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی بھی طالب علم اقامت گاہ کے نگراں کی اجازت کے بغیر اقامت گاہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

اقامت گاہ کی زندگی جوں جوں لگے بندھے معمول پر آتی گئی، طلبا اسے خوشگوار بنانے

کے طریقے ڈھونڈتے گئے۔ معمول کی زندگی کی بیزار کن یکسانیت پر قابو پانے کے لیے طلبا نے 'روایتوں' کا ایک پورا سلسلہ قائم کرلیا۔ ان میں سے ایک روایت 'تعارف' تھی۔ جیسے ہی نیا تعلیمی سال شروع ہوتا اور نئے طلبا اقامت گاہ میں آتے، تو وہ پرانے طلبا سے اپنا تعارف کراتے۔ پرانے طلبا جو کالج میں دو چار سال گزار چکے ہوتے، اس کام کے لیے ایک کمرے میں بیٹھ جاتے۔ تعارف عموماً نووارد طالب علم سے نقد رقم لے کر ختم کیا جاتا۔ اس طرح جو رقم جمع ہوتی اس سے داخلے مکمل ہونے کے بعد اقامت گاہ میں ایک 'بھیا پارٹی' کا انتظام کیا جاتا۔ بے وقوف بنانے کی اس قدرے تفصیلی تقریب کا مقصد پرانے اور نئے طلباء کو بڑے اور چھوٹے بھائیوں کے مانند ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔

اسی طرح کی ایک 'روایت' تقریری کلب کے انتخابات کے سلسلے میں قائم کی گئی تھی۔ نائب صدر اور معتمد کے عہدوں کے لیے امیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی جمع ہونے کے بعد امیدوار طلبا اپنے کمروں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان کے انتخاب کی مہم ان کے ساتھی چلاتے جن کا سربراہ کوئی پرانا طالب علم ہوتا تھا جس کو امیدوار کا خاص کارکن کہا جاتا تھا۔ انتخابات کے نتائج کا اعلان ہونے کے بعد جیتنے والے امیدوار کے کارکن ایک چارپائی پر سفید چادر ڈالے گویا جنازہ اٹھائے ہارے ہوئے امیدوار کے خاص کارکن کے کمرے پر جاتے۔ وہاں ہارے ہوئے امیدوار کے سارے پرانے کارکن ایک کے بعد ایک بلائے جاتے، اسٹول پر کھڑے کیے جاتے، لالٹین کی روشنی میں ان کے چہرے دکھائے جاتے، اور انتخاب کی مہم چلانے پر ان کا مذاق اڑایا جاتا۔ اس رسم کا نام 'جنازہ پیٹنا' تھا[56]۔

دیوبند کی طرح علی گڑھ بھی 'اپنی مدد آپ' کے اصول کا قائل تھا۔ یہ اصول سرسید کی اس حکمتِ عملی سے میل کھاتا تھا جس کا مقصد ایک ایسا خود کفیل نظامِ تعلیم قائم کرنا تھا جو مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکے۔

جدول ب

برس	انٹرنس امتحان میں بیٹھے	انٹرنس پاس ہوئے	کالج پاس فیصد	یونیورسٹی پاس فیصد	انٹرمیڈیٹ امتحان میں بیٹھے	انٹرمیڈیٹ پاس ہوئے	کالج پاس فیصد	یونیورسٹی پاس فیصد
1876-77	9	8	88.8	-	-	-	-	-
1877-78	-	6	-	-	1	-	0	-
1878-79	1	-	0	-	1	-	0	-
1879-80	8	5	62.5	-	8	4	50	-
1880-81	13	13	100	-	8	5	62.5	-
1881-82	13	9	69.2	-	12	7	58.3	-
1882-83	13	9	69.2	-	14	9	64.2	-
1883-84	31	19	61.2	-	14	9	64.2	-
1884-85	-	-	-	-	-	-	-	-
1885-86	32	16	50	-	8	3	37.5	-
1886-87	39	15	39	-	13	10	77	-
1887-88	33	17	51	-	15	9	60	-
1888-89	37	29	-	-	31	13	40	-
1889-90	37	29	78	53.9	31	13	42	45.1
1890-91	33	17	51	47.7	29	9	31	45.1
1891-92	31	16	51.6	40	34	16	47	30
1892-93	27	13	48.4	42.1	37	20	54	45
1893-94	54	23	42.6	35.4	51	20	38	39.6
1894-95	59	9	15.2	31	64	14	37	33
1895-96	62	5	8	39.9	80	26	32.5	89.4
1896-97	29	11	37.3	55	68	20	28	41
1897-98	14	5	36	38	44	13	29	27
1898-99	18	11	61	47	39	16	41	48

جدول ب

برس	بی اے				ایم اے				ایل ایل بی			
	امتحان میں بیٹھے	پاس ہوئے	کالج پاس فیصد	یونیورسٹی پاس فیصد	امتحان میں بیٹھے	پاس ہوئے	کالج پاس فیصد	یونیورسٹی پاس فیصد	امتحان میں بیٹھے	پاس ہوئے	کالج پاس فیصد	یونیورسٹی پاس فیصد
1876-77	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1877-78	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1878-79	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1879-80	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1880-81	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1881-82	4	1	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1882-83	5	2	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1883-84	5	4	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1884-85	3	2	66.6	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1885-86	3	3	100	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1886-87	6	2	25	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1887-88	4	2	50	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1888-89	8	5	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
1889-90	8	5	62.5	65	-	-	-	-	-	-	-	-
1890-91	4	2	50	91.66	-	-	-	-	-	-	-	-
1891-92	12	9	75	50	1	1	100	-	2	0	0	36
1892-93	15	9	60	57.2	-	-	-	-	6	2	23.3	46.1
1893-94	21	19	90.5	67.4	-	-	-	-	-	-	-	-
1894-95	25	19	76	71	2	2	100	-	7	4	57	-
1895-96	29	16	55	48	3	4	75	55.5	6	3	50	30
1896-97	30	10	33.3	54	1	-	-	-	14	5	35.7	21
1897-98	36	20	56	50	2	3	66.6	68	20	5	25	24
1898-99	36	25	69	54	-	1	-	58	19	5	36	24

یہ جدول ایس کے بھٹناگر کی کتاب کے صفحات 75 اور 135 سے لی گئی ہیں۔

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ دورۂ انگلستان نے، حکومت کی عدم مداخلت، ادارے کی خود اختیاری، اور اپنی مدد آپ کے بارے میں، ان کے خیالات کی بڑی ہمت افزائی کی تھی[57]۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ ان اصولوں کو خیال اور عمل دونوں شکلوں میں سرسید کے دورۂ انگلستان سے بہت پہلے دارالعلوم دیوبند نے اپنا رکھا تھا، اور انھوں نے ان پر عملدرآمد ہوتے انگلستان ہی میں نہیں دیکھا تھا۔ سید محمود، جن کا کردار ایم۔اے۔او کالج کے قیام میں کچھ کم نہیں ہے، بچوں کی تعلیم میں برطانوی عوام کی مالی معاونت سے بڑے متاثر تھے[58]۔ اس لیے کالج قائم کرنا اور اسے عطیہ کنندگان کی مدد سے، خصوصاً مسلمانوں کے عطیوں سے چلانا، بانیانِ کالج کی بڑی سوچی سمجھی حکمتِ عملی تھی۔

کالج کے لیے خود کبھی کبھی عطیہ دینے کے علاوہ، سرسید نے رقومات جمع کرنے کے لیے متعدد ذرائع اختیار کیے تھے۔ انھوں نے قرعہ اندازی کے ذریعے رقم جمع کرنے کا طریقہ اختیار کیا، اور انعامات دینے کے بعد 20,000 روپے کی رقم بچالی۔ انھوں نے اپنی کتابیں اور تصویریں فروخت کیں۔ وہ متموّل لوگوں سے خاندانی خوشیوں کے موقعوں پر رقومات طلب کرتے، اور دوستوں سے دعوتوں کی پیش کش کے عوض روپیہ طلب کرتے۔ حتیٰ کہ کالج کے واسطے روپیہ اکٹھا کرنے کے لئے انھوں نے اسٹیج پر اداکاری بھی کی[59]۔ روپے اکٹھا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ عطیہ کنندگان کے ناموں کے پتھر کمروں پر اور اسٹریچی ہال میں لگائے جاتے۔ چوکور احاطے کے دروازے جن عطیہ کنندگان نے بنوائے وہ دروازے ان عطیہ کنندگان کے نام سے منسوب کیے گئے۔

برطانوی اشخاص نے بھی عطیات دیے تھے۔ یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور نے اپنی جیب خاص سے ایک ہزار روپے دیے تھے۔ لارڈ نارتھ بروک نے ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا، اور 'انڈین مسلمانس' کے مصنف ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر نے پندرہ سو روپے دیے تھے۔ سرسید

کے سوانح نگار جی، ایف آئی گراہم کے ایک رشتے دار نے ایک ہزار روپے دیے تھے۔

اسی طرح ہندوؤں نے بھی عطیات دیے تھے۔ مہاراجہ وزیانگرم نے تین ہزار روپے دیے تھے۔ ضلع علی گڑھ کے موضع بیسواں کے ٹھاکر گروپرشاد سنہا نے پانچ سو روپے دیے تھے۔ بجنور کے کنور جگت سنگھ نے دوسو روپے دیے تھے۔ بنارس کے بابو ستیارام نے ایک سو ایک روپے دیے تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے دو قسطوں میں تین ہزار روپے دیے تھے [60]۔

کالج فنڈ کمیٹی کے پاس، جواب رجسٹریشن آف سوسائٹیز ایکٹ 1860 کے تحت رجسٹر ہو چکی تھی، 5 فروری 1875 کو دو لاکھ روپے جمع ہو چکے تھے [61]۔

بعض دیسی ریاستیں کسی خاص مقصد کے لیے عطیہ دینے کے علاوہ باقاعدگی سے بھی روپیہ دیا کرتی تھیں، اور بعض ریاستیں وقتاً فوقتاً روپیہ دیا کرتی تھیں۔ کچھ اسی طرح سے بعض متمول اشخاص بھی عطیات دیا کرتے تھے۔

ریاست حیدرآباد نے 1875 میں ایک جاگیر عطا کی جس کی سالانہ آمدنی دو ہزار چار سو روپے تھی۔ سالار جنگ نے ایک جاگیر دی جس کی سالانہ آمدنی بارہ سو روپے تھی [62]۔ اعلیٰ مرتبت آغا خاں نے 1910 میں اپنے عطیے کی رقم بڑھا کر دس ہزار روپے سالانہ کر دی تھی۔ اسی طرح 1910 میں بیگم بھوپال نے بھی اپنے عطیے کی رقم بڑھا کر چھ ہزار روپے سالانہ کر دی تھی۔ اسی سال مہاراجہ گوالیار نے کالج کو ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ اس کے اگلے سال حکومت نے کالج کو دو لاکھ روپے کی یک وقتی امداد دینا منظور کی تھی [63]۔

اس لیے مندرجہ بالا سطور میں دی جانے والی معلومات سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا ادارے کی افادیت میں لوگوں کا اعتماد بڑھتا گیا اور اسی کے ساتھ عطیات کی رقومات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ یہ بات درست ہے کہ دیوبند کے برخلاف علی گڑھ کو حکومت سے مالی امداد لینے میں کوئی عار نہ تھا، بلکہ بانیانِ کالج سرکاری امداد کا ہمیشہ خیر مقدم کرتے

تھے، پھر بھی کالج کو بڑی حد تک خود اپنے ہی وسائل پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔

کالج خوب مشہور ہو گیا تو اس کے میز ایبل کا خاصہ بڑا حصہ فیسوں سے حاصل ہونے لگا۔ پھر بھی ادارہ آسانی سے نہیں چل پاتا تھا۔ سرسید نے 1889 میں لکھا تھا کہ لوگوں کو کالج کی مالی حالت کا غلط اندازہ ہے۔ ہر نیا مہینہ تنخواہیں وغیرہ ادا کرنے کی پریشانیاں ساتھ لاتا ہے[64]۔ اس لیے علی گڑھ مالی اعتبار سے دیوبند کے مقابلے میں کہیں بہتر ہونے کے باوجود ان اداروں سے بہتر نہیں تھا جن کی کفالت پورے طور سے سرکار کرتی تھی۔

ہندوستانی سیاست میں علی گڑھ کے کردار کے بارے میں ہمیشہ اختلافات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ہندوستانی سیاست میں علی گڑھ کے کردار کی نسبت جواہر لعل نہرو کا خیال ہے کہ 'یہ نہ ہندو مخالف تھا اور نہ فرقہ وارانہ طور پر علاحدگی پسند'[65]۔ لیکن ان سیاسی واقعات نے جو تقسیم ہند پر منتج ہوئے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کے ہندوستان میں علی گڑھ کے اصل سیاسی موقف کو دھندلا کے رکھ دیا۔ یہ درست ہے کہ سرسید نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ علی گڑھ احتجاجی سیاست سے دور رہے مبادا مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی رفتار سست پڑ جائے کیونکہ مسلمان پہلے ہی اس دوڑ میں بہت دیر سے شامل ہوئے تھے۔ حالی کے الفاظ میں 'سرسید اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ 1857 کی بغاوت، جس میں مسلمانوں کے ہزاروں خاندان برباد ہو گئے، محض ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھی، اور سیاسی وجوہات کی بنا پر پیدا ہونے والی نفرت یا کسی عمومی سازش کا نتیجہ نہ تھی'[66]۔ مسلمانوں کو کانگریس کی احتجاجی سیاست سے دور رکھنے کے اسباب بیان کرتے ہوئے حالی نے لکھا ہے کہ 'سرسید تیس سال سے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مفاہمت اور دوستی کے لیے کوشش کر رہے تھے، اور یہ امید لگائے ہوئے تھے کہ یہ دونوں لوگ بالآخر ایک دوسرے پر بھروسہ اور اعتبار کرنے لگیں گے۔ اس لیے سرسید ہر وہ کوشش کرنے کے لیے بے چین تھے جس سے مسلمانوں کو دوسری دفعہ برطانوی شک و شبہ کا ہدف بننے سے روکا جا سکے'[67]۔

ایسا لگتا ہے جیسے حالی نے شبلی کے بین السطور خیالات پڑھ لیے تھے، اور انھوں نے ان 'حالات' کی تشریح کی ہے جنھوں نے جرأت مند سید کو مجبور کر دیا کہ 'وہ مسلمانوں کو قومی تحریک میں اپنا کردار ادا کرنے سے باز رکھیں'[68]۔ سرسید کو یقین تھا کہ سیاسی مقاصد زور زبردستی سے نہیں بہلا پھسلا کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے انڈین نیشنل کانگریس کی احتجاجی سیاست کے اثرات کا توڑ کرنے کے لیے 1888 میں پہلے تو یونائیٹڈ پیٹریوٹک ایسوسی ایشن، اور پھر دسمبر 1893 میں غالباً پروفیسر بیک کے ایما پر محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفینس ایسوسی ایشن آف انڈیا بنائی گئی۔

اول الذکر ایسوسی ایشن کے عزائم اور مقاصد مندرجہ ذیل تھے:

(ا) انگریزی پارلیمان کے اراکین کو، انگریزی جریدوں کو اور انگلستان کے عوام کو مطلع کرنے کے لیے ان کتابچوں اور دوسرے کاغذات کو طبع کرانا اور تقسیم کرانا جن میں انڈین نیشنل کانگریس کے حامیوں کے ان غلط بیانوں کی نشاندہی کی گئی ہو جو انھوں نے انگریزی عوام کو گمراہ کرنے کے لیے دیے ہوں تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ ہندوستانی قومیں، نامورانِ ہندوستان اور ریاستی حکمراں سب انڈین نیشنل کانگریس کے عزائم اور مقاصد سے اتفاق رکھتے ہیں۔

(ب) انہی ذرائع سے برطانوی اراکین پارلیمان کو، برطانوی اخبارات اور عوام کو 'عام مسلمانوں' اسلامی انجمنوں، نیز ان ہندوؤں اور ان کی سوسائیٹیوں کے خیالات سے آگاہ کرانا جو انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد کے خلاف ہیں۔

(ج) ہندوستان میں امن قائم رکھنا اور برطانوی حکمرانی کو مضبوط کرنا، اور ہندوستانی عوام کے دلوں سے ان برے احساسات کو دور کرنا جو کانگریس کے حامی سارے ملک میں پھیلا رہے ہیں اور جن کی بنا پر عوام میں برطانوی حکومت کے خلاف بے اطمینانی بڑھ رہی ہے[69]۔

یونائیٹڈ پیٹریوٹک ایسوسی ایشن کے عزائم اور مقاصد کی بابت یہ طویل حوالہ ان دنوں کی

ہندوستانی سیاست کے بارے میں علی گڑھ کا موقف، اور برطانوی پارلیمان نیز برطانوی عوام کو اس موقف سے آگاہ کرنے کے طریقے کی تشریح کے لیے دیا گیا ہے۔ سرسید ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان احتجاجی سیاست کا خطرناک راستہ اختیار کریں۔

مسلمانوں کو قومی سیاست سے دور رکھنے کے دو سبب تھے۔ (1) ان کا یہ عقیدہ کہ مسلمانوں کی پسماندگی تعلیم کے ذریعے، نہ کہ قومی اور بین الاقوامی سیاست میں شرکت کے ذریعے، دور کی جاسکتی ہے۔ اور (2) ان کی یہ تشویش کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے باہمی اعتماد کو کم کرنے کے لئے اگر سیاست کو بے لگام چھوڑ دیا گیا تو 1857 جیسے واقعات دوبارہ بھی پیش آسکتے ہیں۔ دونوں سبب ایک ہی اکائی کے جز تھے، اور ایک کو دوسرے سے جدا کر کے نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ ان کے نزدیک سب سے مقدم بات یہ تھی کہ برطانوی لوگوں اور برطانوی حکومت سے مخالفت کا نہیں مفاہمت کا رشتہ بنا رہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں صرف اسی طرح کا ماحول مسلمانوں کی ترقی کو یقینی بنا سکتا تھا۔

1882 میں جب عثمان ترکوں اور انگریزوں میں مصر کے سوال پر جنگ چھڑی تو یہی مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان اچھے تعلقات قائم رکھنے کی حکمت عملی تھی جس کے تحت سرسید نے ترکوں کے مقابلے میں انگریزوں کی طرف داری کی۔ مصری سوال پر برطانیہ موافق کردار کی وجہ سے انھیں سید جمال الدین افغانی (1839 تا 1897) کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو ایک تجربہ کار اور عمر رسیدہ مسلم قاعد تھے، اور اتحادِ اسلامی (پین اسلامک) خیالات کے لیے مشہور تھے۔

اسی طرح 1897 میں جب ترکی اور یونان کے درمیان جنگ چھڑی تو عام مسلمانوں کی رائے کے خلاف، سرسید برطانیہ کے ساتھ تھے، جو یونان کے مقصد کی حمایت کر رہا تھا۔

ان دلیلوں سے یہ بات پورے طور سے صاف ہو جاتی ہے کہ قومی سیاست میں علی گڑھ کے موقف کے محرکات فرقہ وارانہ خیالات نہیں تھے بلکہ ملک میں وہ امن قائم رکھنے کی نہایت

شدید خواہش تھی جو تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کی ترقی کے واسطے ایک نہایت ضروری شرط کی حیثیت رکھتا تھا۔

1886 میں پہلی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا: 'میں ان لوگوں سے متفق نہیں ہوں جو سمجھتے ہیں کہ سیاسی معاملات پر بحث کر کے قوم ترقی کر سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صرف تعلیم ہی قوم کی ترقی کو یقینی بنا سکتی ہے'[70]۔ پروفیسر بیک نے بھی 1893 میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفینس ایسوسی ایشن کے افتتاحی جلسے میں اسی نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے: '.....مسلمانوں کے خوش حال مستقبل کا دارومدار بہت کچھ تعلیم پر ہے سیاست پر نہیں، اور یہ بڑی غلطی ہوگی اگر ہم نے لوگوں کی اس توانائی کو سیاست کی راہ پر موڑ دیا' جس کے لیے ہم انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ تعلیم کا رخ کر لے۔ سیاست اہم صحیح، لیکن مسلمانوں کے خوشحال مستقبل کے لیے کہیں کم حیثیت کی چیز ہے'[71]۔

اس لیے علی گڑھ کا سیاسی موقف کچھ انڈین نیشنل کانگریس کی عملی مخالفت کی بنا پر اتنا نہیں تھا جتنا مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کی خاطر امن و اتفاق قائم رکھنے کی بنا پر تھا۔

سرسید احمد خاں کی تصانیف

1۔ ایکٹ نمبر 10 (اسٹامپ ایکٹ 1862)

2۔ ایکٹ نمبر 14 (کمیشن ایکٹ 1859)، پرائیویٹ پریس، علی گڑھ 1864

3۔ ایکٹ نمبر 16 (دستاویزات کو رجسٹر کرانے کی بابت)، مصنف کا پرائیویٹ پریس، علی گڑھ، 1864

4۔ احکام طعام اہل کتاب، نول کشور، کانپور، 1868، مطبع العلوم، علی گڑھ 1899

5۔ آئین اکبری (ایڈیشن مع توضیحات)، دہلی

6۔ الدعاء والاستجابہ، مفید عام پریس، آگرہ، 1892

7۔الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ، فیض عام پریس، علی گڑھ، 1900؛ انگریزی ترجمہ، لندن، 1869 - 1870

8۔النظر فی بعض مسائل امام الغزالی، مفید عام پریس، آگرہ

9۔آثار الصنادید، (i) سید الاخبار، 1847، (ii) مطابع سلطانی 1852

10۔اسباب بغاوت ہند، پہلی دفعہ 1858 میں اردو میں طبع ہوئی، پھر ان کے دو یورپی دوستوں نے انگریزی میں ترجمہ کیا، میڈیکل ہال پریس، بنارس۔

11۔ڈسکرپشن ڈس مونومینٹ ڈی ڈیل ہی، 1852، ڈاپریس لے ٹیکسٹے ہندوستانی ڈے سید احمد خاں (ترجمہ: ایم گارساں دی تاسی)، پیرس امپرائمیری امپریلے، 1861۔

12۔ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیادار کی کہانی، نظامی پریس، بدایوں، 1901۔

13۔التماس بخدمت ساکنین ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہل ہند، پرائیویٹ پریس، غازی پور، 1863

14۔عزالت الغین اقضیا القرنین، مفید عام پریس، آگرہ، 1889

15۔جام جم، اکبر آباد، 1840۔

16۔جلا القلوب بہ ذکر المحبوب، دہلی، 1843

17۔کلمات الحق، انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ

18۔خلق الانسان الا مانی القرآن، مفید عام پریس، آگرہ، 1892

19۔خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، نظامی پریس، 1924

20۔کیمیائے سعادت، دو فصل، انسٹی ٹیوٹ پریس، 1883

21۔لیکچر درباب ترغیب و تحریص تعلیم اطفال مسلمانان، 1895، مفید عام پریس، آگرہ، 1896

22۔ لیکچر انڈین نیشنل کانگریس پر، نامی پریس، کانپور، 1887

23۔ لیکچر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تاریخی حالات اور جدید واقعات پر، مفید عام پریس، آگرہ، 1889

24۔ لیکچر اجلاس دہم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، مفید عام پریس، آگرہ، 1895

25۔ لیکچر متعلق اجلاس یازدہم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، مفید عام پریس، آگرہ، 1895

26۔ 1864 کے ایکٹ ششم پر دیے جانے والے لیکچر، 4 دسمبر 1864 کو سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے دیے گئے، پرائیویٹ پریس، علی گڑھ، 1864

27۔ مجموعہ لیکچر ہائے سرسید، تدوین منشی سراج الدین، بلالی پریس، سدھورا، 1892

28۔ مجموعہ ریزولوشن ہائے دہ سالہ (محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس 1886 تا 1895) تدوین سرسید، مفید عام پریس، آگرہ، 1896

29۔ مقالات سرسید، مرتبہ عبداللہ خویشگی، علی گڑھ نیشنل پرنٹرس، 1952

30۔ مقالات سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل، لاہور

31۔ مضمون بہ نسبت تنزل علوم دینیہ و عربیہ و فلسفۂ یونانیہ، مفید عام پریس، آگرہ، 1857

32۔ مکاتیب سرسید، مشتاق حسین، دہلی، 1960

33۔ مکتوبات سرسید، محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، 1959

34۔ مکمل مجموعہ لیکچرس و اسپیچز، تدوین ملک فضل الدین، لاہور، 1900

35۔ مکاتبات الخلّن، تدوین محمد عثمان مقبول، احمد پریس، علی گڑھ، 1915

36۔ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ (تقاریر سید احمد خاں و سید مہدی علی خاں، وغیرہ)

مفید عام پریس، آگرہ، 1894

37۔ نمیقہ فی بیان مسئلہ تصور الشیخ، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس، 1883

38۔ ہنٹر کی کتاب "Our Indian Musalman" پر، لندن، 1872

39۔ On the use of Sector (اردو)، سید الاخبار، 1846

40۔ Present State of Indian Politics (اس میں لیکچرس اور تقاریر ہیں)، الہ آباد پریس، 1888

41۔ قول المتین در ابطال حرکت زمین، سید الاخبار، دہلی، 1848

42۔ راہ سنت در رد بدعات، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس، 1883

43۔ رپورٹ سالانہ (مدرسۃ العلوم کے بورڈنگ ہاؤس کی سالانہ رپورٹ 1879) انسٹی ٹیوٹ پریس، 1880

44۔ رسالہ ابطال غلامی، مفید عام پریس، آگرہ، 1893

45۔ رسالہ ہوالموجود، انسٹی ٹیوٹ پریس، 1880

46۔ رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ، 1860

47۔ سرکشی ضلع بجنور، آگرہ، 1858

48۔ سلسلات الملوک، اشرف المطابع، دہلی، 1852

49۔ سیرت فریدیہ، مفید عام پریس، آگرہ، 1896

50۔ تابعین الکلام فی تفسیر التورات والانجیل الامت الاسلام، (مقدس انجیل پر مسلمانوں کے توضیحی حواشی)

جلد اول: 1862، مصنف کانجی پریس، غازی پور۔

جلد دوم: 1865، نجی پریس، غازی پور۔

جلدسوم: 1887، انسٹی ٹیوٹ پریس۔

51۔ تفسیر القرآن

جلداول: انسٹی ٹیوٹ پریس، 1880

جلددوم: انسٹی ٹیوٹ پریس، 1882، مفید عام پریس، آگرہ، 1903

جلدسوم: انسٹی ٹیوٹ پریس، 1885

جلد چہارم: انسٹی ٹیوٹ پریس، 1888

جلد پنجم: انسٹی ٹیوٹ پریس، 1892

جلد ششم: انسٹی ٹیوٹ پریس، 1895

جلد ہشتم: مفید عام پریس، آگرہ، 1904

52۔ تفسیر الجن والجان الامانی القرآن، رحمانی پریس لاہور، 1893، مفید عام پریس، آگرہ، 1891

53۔ تفسیر السماوات، مفید عام پریس، آگرہ، 1315ھ

54۔ تحریر فی اصول التفسیر، مفید عام پریس، آگرہ، 1892

55۔ تاریخ فیروز شاہی (ایڈیشن)، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، 1862

56۔ تشیل فی جر الثقیل، اورفنس پریس، آگرہ، 1844

57۔ ترجمہ فوائد الافکار فی عمل الفرجار، سید الاخبار، دہلی، 1846

58۔ ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم، مفید عام پریس، آگرہ، 1889

59۔ تصفیات العقائد (اردو) سید احمد خاں اور دیوبند کے مولانا محمد قاسم کے درمیان ہونے والی خط و کتابت، ضیائی پریس

60۔ تحفۂ حسن، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس، 1883

61۔توزکِ جہانگیری (ایڈیشن)، نجی پریس، علی گڑھ، 1864

62۔تصانیفِ احمدیہ (مذہبی عنوانات پر سید احمد خاں کی تحریروں کا مجموعہ) جلد اول، حصہ اول (جلاء القلوب، تحفۂ حسن، کلمات الحق، راہ سنت، نمیقہ، کیمیائے سعادت کے ابواب کا ترجمہ، تابعین الکلام حصہ اول و دوم)، انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، 1883

حصہ دوم (تفسیرِ انجیل، رسالہ احکام طعام، خطباتِ احمدیہ)، انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، 1887

حصہ سوم تفسیر القرآن، انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، 1880

حصہ چہارم تفسیر القرآن، جلد دوم، انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، 1882

حصہ پنجم تفسیر القرآن جلد سوم، انسٹی ٹیوٹ پریس، 1885

حصہ ششم تفسیر القرآن، جلد چہارم، انسٹی ٹیوٹ پریس، 1888

حصہ ہفتم تفسیر القرآن، جلد پنجم، انسٹی ٹیوٹ پریس، 1892

حصہ ہشتم تفسیر القرآن، جلد ششم، انسٹی ٹیوٹ پریس، 1895 72/1

حوالہ جات

1- C.F.Andrews, Zakaullah of Dilli, W. Heffer and Sons Ltd, Cambridge, 1929.

انہوں نے زور دے کر یہ بات کہی کہ دلی کالج کے قیام کے بعد احیاء علوم کا دور شروع ہوا، جسے 1857 کی بغاوت نے ختم کر دیا۔

2- G.F.I. Graham, The life and Work of Sir Sayyid Ahmad Khan, Oxford University Press, London, 1974, p. 21

3- Altaf Husain Hali, Hayat-e-Javed, Idarah-e-Adabiyat Dilli, Delhi, 1979, p. 59

4- علی گڑھ میگزین (علی گڑھ تحریک)، 1960 صفحہ 2، سید عابد حسین کا مضمون 'سید کا خواب اور اس کی تعبیر، تہذیب الاخلاق کے حوالے سے یہ مضمون لکھا گیا ہے۔

5- Altaf Husain Hali, op. Cit; p. 56

6- ان کی تحریروں کی ایک فہرست اس باب میں دی گئی ہے۔

7- سید عابد حسین نے اپنے مضمون 'سید کا خواب اور اس کی تعبیر' میں اس کا تفصیلی خاکہ دیا ہے، علی گڑھ میگزین، 1960

8- الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، مطبع مفید عام، آگرہ، 1903، صفحہ 135

9- Altaf Husain Hali, op. cit; p. 56

10- تہذیب الاخلاق (انتخاب) جلد دوم، مرتبہ ملک فضل الدین کاکے زئی، قومی بازار، لاہور، صفحہ 453

11- G.F.I. Graham, op. cit; p. 132

12- Altaf Husain Hali, op. cit: pp. 59-60

13- Altaf Husain Hali, op. cit; p. 172

14- مکتوباتِ سرسید، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1959، صفحہ 21

15- الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، جلد دوم، مطبع مفید عام، آگرہ، 1903، صفحہ 87

16- تہذیب الاخلاق، جلد اول، متذکرہ بالا رسالہ، صفحہ 193 (محسن الملک کے مضامین، تدبیر و امید)

17- Shan Mohammad, The Aligarh Movement, Basic Documents, Vol III, Meenakshi Prakashan, Meerut, 1978, P. 756

18- Shan Mohammad, op. cit; pp. 703-704

19- Altaf Husain Hali, op. cit; p. 107

20- Shan Mohammad, op. cit; p. 756

21- Ibid, p. 767

22- Ibid, pp. 772-773

23- Altaf Husain Hali, op. cit; p. 85

24- Ibid, p. 89

25- Ibid, p. 92

26- Ibid, p. 97

27- G.F.I. Graham, op. cit; p. 132

28- ایسے نظامِ تعلیم کی بابت سرسید کے خیالات جو کسی قوم کی ضرورتوں کو پورا کر سکے ان کے مضمون میں بڑی تفصیل سے دیے گئے ہیں۔ ان کا مضمون جس کا عنوان "Strictures upon the Present Educational System in India" تھا مندرجہ ذیل پبلشر نے چھاپا تھا: Hery S King Co., 65 Cornhill, London, 1869

29- Altaf Husain Hali, op. cit; p. 185

30- G.F.I. Graham, op. cit; p. 132

31- گراہم نے لکھا ہے کہ سرسید دو ملازماؤں این، اسمتھ اور ایلز بیتھ مینھیوز کے اچھے برتاؤ اور فرائض کی ادائیگی سے بڑے متاثر تھے، اور ان خوبیوں نیز دوسری خوبیوں کو ان کی تعلیم و تربیت سے منسوب کرتے تھے۔

G.F.I. Graham, op. cit; p. 132

32- Altaf Husain Hali, op. cit; p. 130

33- S.K. Bhatnagar, History of M.A.O. College, Aligarh, Asia Publishing House, Bombay, 1969, p. 38

یہ حوالہ انھوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے دیا ہے۔

34- Altaf Husain Hali, op. cit; p. 160

35۔ David Lelyveld, Aligarh's First Generation, Oxford University Press, New Delhi, 1978, p. 156

لاہور کے جج مشتاق حسین کی جمع کردہ اشیا میں انھوں نے اس طرح کی ایک تصویر دیکھی تھی۔

36۔ مقالاتِ سرسید، جلد بائیس، مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، صفحات، 82 تا 86

37۔ مقالاتِ سرسید، متذکرہ بالا کتاب، صفحات، 79 تا 80

38۔ سید محمود، یونیورسٹی کیمبرج، تہذیب الاخلاق، جلد چہارم (وقار الملک، سید محمود، حالی اور ذکاء اللہ کے مضامین کا مجموعہ) مرتبہ ملک فضل الدین، کشمیری گیٹ، لاہور

39۔ مقالاتِ سرسید، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 89

40۔ سید محمود، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 83

41۔ 'سید کا خواب اور اس کی تعبیر' میں سید عابد حسین کی رائے کے مطابق، متذکرہ بالا رسالہ، صفحہ 13

42۔ David Lelyveld, op. cit; pp. 206-207

43۔ S.K. Bhatnagar, op. cit; p. 57

44۔ Ibid , p. 153

45۔ مکتوباتِ سرسید، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 209

46۔ ایضاً، صفحہ 211

47۔ ایضاً، صفحات، 91، 92

48۔ G.M.D. Sufi, Al-Minhaj, Shaikh Mohammad Ashraf,

Lahore, 1941, p. 136.

49- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مارچ 19، 1887

50- ایضاً، فروری 28، 1893

51- ایضاً، ستمبر 28، 1880

52- ایضاً، جنوری 19، 1886

53- ایضاً، دسمبر 22، 1885

54- مقالاتِ سرسید، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 82

55- سید محمود، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 84

56- یہ روایات ابھی تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جاری ہیں۔ اس صدی کی دوسری دہائی کے طلبا نے بتایا کہ ان کے زمانہ طالب علمی میں بھی یہ جاری تھیں۔

57- Dawood Rahbar. op. cit; p. 114

58- Altaf Hussain Hali. op. cit; p. 135

59- Ibid, pp. 150-151

60- S.K. Bhatnagar, op. cit; pp. 37-38

61- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، فروری 10، 1875

62- S.K. Bhatnagar, op. cit; p. 49

63- Ibid, p. 276

64- علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، دسمبر 1889

65- J.L. Nehru, Discovery of India, Meridian Books, Ltd; London, 1947, p. 347

66- Altaf Husain Hali, op. cit; p. 206

67- Ibid, p. 206

68- سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، مطبع علیمی، دہلی، 1945، صفحہ 321

69- Shan Mohammad, op. cit: p. 907

70- سید طفیل احمد، تذکرہ مشاہیر کتاب، صفحہ 282

71- Shan Mohammad, op. cit: p. 1033

72- K.A. Nizami, Saiyyid Ahmad Khan, Publication Division, Ministry of Education and Broadcasting, Government of India, New Delhi, 1974, pp. 177-181

سرسید احمد خاں کی تصانیف کی فہرست خلیق احمد نظامی کی اسی کتاب سے لی گئی ہے۔

باب چہارم

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اٹھارھویں صدی میں مغربی تعلیم وتہذیب کے چیلنج پر مسلمانوں کا جوابی عمل 1867 میں دارالعلوم دیوبند اور 1877 میں ایم، اے، او کالج علی گڑھ کے قیام کی شکل میں ظاہر ہوا۔ دیوبند کا مکتب فکر تقریباً ہر صورت میں علی گڑھ کے مکتب فکر کی ضد تھا۔ تعلیم اور سیاست کے معاملے میں دونوں کے نظریے جداگانہ تھے۔ دیوبند حد درجہ محتاط تھا، اور آزاد خیال علوم (لبرل آرٹس)، جدید سائنس اور انگریزی زبان کی تعلیم کے سلسلے میں ڈھیل دینے کو تیار نہ تھا۔ علی گڑھ اس درجہ آزاد خیال تھا کہ ان ہی مضامین کی تعلیم کو ترجیح دیتا تھا۔ قومی اور بین الاقوامی سیاست کے معاملے میں ان کے موقف بالکل الٹ گئے تھے۔ علی گڑھ کا رویہ بڑھتی ہوئی احتیاط پر مبنی تھا جب کہ دیوبند نہایت آزاد خیال تھا۔

نظریات کے اس فرق کو ان لوگوں کے بیانات کی روشنی میں زیادہ اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے، جنھوں نے ان اداروں کو بنانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔ سرسید نے کہا تھا: '..... میرا مشاہدہ ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم دینے کی ساری کوششوں کا رخ اسی نظامِ تعلیم کی

طرف ہوتا ہے جو ہمیں ورثے میں ملا ہے یعنی وہی پرانا دقیانوسی درسِ نظامی۔ چنانچہ اس زمانے میں مسلمانوں نے جو ادارے جونپور، علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، دیوبند، دہلی، لاہور میں قائم کیے ہیں وہ اسی پرانے نظام کے نمونے پر قائم کیے گئے ہیں۔ لیکن میں بڑی سنجیدگی سے کہتا ہوں کہ یہ بیکار اور فضول ہیں۔ امید نہیں کہ قوم کو ان سے کوئی فائدہ پہنچے[1]۔

باوجود اس کے علی گڑھ کالج کے لوگوں نے تعلیمِ دینیات کے پروگرام کے انصرام و انتظام کے لیے جب بانی دیوبند مولانا قاسم نانوتوی سے رجوع کیا تو انھوں نے اپنی آمادگی کا اظہار تو کیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ سرسید کالج سے علاحدہ ہو جائیں[2]۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا نانوتوی مغربی تعلیم کے حصول کے اتنے مخالف نہیں تھے جتنے سرسید کے، جو مذہبی عقائد کی غیر ضروری ترجمانی کرتے، عربی مدارس پر تنقید کرتے اور مسلمانوں کو انگریزوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب دیتے تھے[3]۔ مولانا نانوتوی کو سرسید کا یہ رویہ اس لیے ناپسند تھا کیونکہ خود مولانا مدارس کے علوم سے محبت کرتے تھے اور انگریزی تہذیب کو ناپسند کرتے تھے۔ دیوبند مولانا نانوتوی کے نظریات پر اس درجہ کاربند رہا کہ اس نے اپنی نشو ونما کی کسی بھی منزل پر مغربی تعلیم اور انگریزی زبان کو اپنے نصاب کا حصہ نہ بنایا۔

یہ دونوں ادارے جو انیسویں صدی میں مغربی تعلیم اور تہذیب کے چیلنج کے جواب میں قائم ہوئے تھے، اور ایک دوسرے سے مختلف تھے، آئندہ بننے والے مسلم اداروں کے لیے نمونہ بن گئے۔ ان کے بعد جو ادارے بنے انھوں نے یا تو ان کے مثل بننا چاہا یا دونوں کے نظریوں میں توازن پیدا کر کے کوئی تیسری شکل اختیار کرنے کی کوشش کی۔

دارالعلوم ندوۃ العلما اس نوع کا اولین ادارہ تھا۔ بظاہر یہ بھی دیوبند کی طرح دینی مدرسہ تھا، لیکن حقیقتاً یہ دیوبند سے کئی معنوں میں مختلف تھا۔ اس کی شہری سماجی فضا، اصلاحِ نصاب کے لیے اس کا عزم، اور ابتدا میں برطانیہ موافق رویہ، ان سب باتوں نے اسے علی گڑھ سے زیادہ

قریب کر دیا، اور اسے ان مدرسوں سے مختلف بنا دیا سرسید جن کو ناپسند کرتے تھے۔

1894 کی نویں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں محسن الملک نے ندوۃ العلماء کے لیے کہا تھا کہ 'سرسید اور ان کے رفقاء جن چیزوں میں چوتھائی صدی سے اصلاح کی کوشش کر رہے تھے بالآخران قابلِ احترام ہستیوں (علما) نے مان لیا ہے کہ وہ واقعی اطمینان بخش نہیں ہیں، اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے طے کیا ہے کہ بے شمار عربی اور فارسی اسکولوں اور مدرسوں میں تدریس کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا رہا ہے، اور جو نصاب پڑھائے جاتے رہے ہیں ان سے اس طرح کے طلبا نہیں تیار ہو پاتے جن کی آج کے دور میں ضرورت ہے'[4]۔

بانیانِ علی گڑھ کالج نے ندوۃ العلماء سے کتنی بڑی توقعات وابستہ کر لی تھیں اس کا اندازہ بھی محسن الملک کی اسی تقریر سے ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا تھا کہ 'اصلاحات وہی علما بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں جن پر آبادی کا بڑا حصہ بھروسہ کرتا ہے اور انھیں عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اب یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے ان لائق رہنماؤں نے مسائل سے لاتعلقی ختم کر دی ہے اور خود ہی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اور اپنے لیے کچھ نہ کچھ خود کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی مہم ہے کہ جو مولویوں کی عام قدامت پسندی کے تناظر میں اپنے عظیم فوائد کی بنا پر ہماری نہایت پُرخلوص اور پُرجوش مدد کی مستحق ہے۔ کانپور کے اس اجتماع کو ہندوستانی مسلمانوں کی حالیہ تاریخ کے ایک نہایت اہم واقعے کے طور پر درج کرنا چاہیے'[5]۔

اس موقع پر محسن الملک نے ایک قرارداد پیش کی اور سید محمود نے بڑی فصاحت کے ساتھ قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ 'یہ کانفرنس ندوۃ العلماء سے پوری ہمدردی رکھتی ہے۔ مسلمان مولویوں کا یہ اجتماع فروری 1894 کو کانپور میں اس مقصد سے ہو رہا ہے کہ مذہبی اور مادّی تعلیم کے طریقوں میں اصلاح کی جائے تاکہ مختلف اسلامی مسالک میں اتفاق اور اتحاد پیدا ہو سکے۔ کانفرنس کو مکمل اعتماد ہے کہ سارے مسلمان اپنے دائرۂ اختیار کے سارے وسائل بروئے کار

لاتے ہوئے اس نئی تحریک کی مدد کریں گے۔[6]

نویں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی رپورٹ سے قدرے طویل حوالے یہ دکھانے کے لیے دیے گئے ہیں کہ ندوۃ العلماء کی تحریک کا بانیانِ علی گڑھ نے کس قدر خیر مقدم کیا۔ ان کے نزدیک یہی وہ تحریک تھی جس کا مقصد ایسے جدید علما پیدا کرنا تھا جن میں سماجی اور مذہبی اصلاح کے لیے وہی جذبہ موجزن ہوگا جو سرسید، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی اور سید محمود کی تحریروں میں جھلکتا ہے ندوہ گویا علی گڑھ کے 'کل کا مذہبی جز'۔ علی گڑھ کو جدید مسلمان پیدا کرنے تھے اور ندوہ کو جدید عالم۔

ندوۃ العلماء کے عمومی اور خصوصی مقاصد

علی گڑھ اس وقت تک پوری طرح مستحکم ہو چکا تھا جب بہت سے علما نے مدرسہ فیضِ عام کانپور کے 1892 کی سالانہ دستار بندی کے موقع پر دو بڑے مقاصد کے تحت ایک تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا۔ ایک مقصد نظامِ تعلیم کی اصلاح تھا، اور دوسرا مقصد مذہبی معاملات میں مختلف نظریات رکھنے والے علما کے درمیان اتحاد قائم کرنا تھا۔ پہلے ناظم مولانا محمد علی مونگھیری (1846 تا 1927) تھے، جن کو تحریک کا اصل بانی کہنا حق بجانب ہوگا۔

مولانا محمد علی مونگھیری نے فیض آباد کے مدرسہ اسلامیہ کے استاد مولانا مشتاق علی نگینوی کو نائب مقرر کیا تا کہ وہ ندوۃ العلماء کے عمومی اور خصوصی مقاصد سے لوگوں کو، خصوصاً علما کو آگاہ کریں۔

مولانا محمد علی مونگھیری کے خط کا خلاصہ حسب ذیل ہے: 'جو طلبا عربی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں وہ دنیا کی روش سے ناواقف رہتے ہیں، اور اس لیے دوسروں کے محتاج رہتے ہیں۔ ان پر وہ مذہبی علم بھی آشکارا نہیں ہو پاتا جو جدید دور کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اسی

لیے یہ تنظیم نظامِ تعلیم کو نئے سرے سے منظم کرنا چاہتی ہے تاکہ طلبا کو صحیح خطوط پر تعلیم دی جا سکے۔
مزید برآں، یہ تنظیم علما کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرے گی کیونکہ ان کے مابین اختلافات سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ وہ دشمنوں کی نظر میں گر جاتا ہے[7]۔
مندرجہ بالا دو عمومی مقاصد کو بعد میں چھ خصوصی مقاصد کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ چھ مقاصد حسب ذیل ہیں:

(ا) تعلیم کی ترقی
(ب) نظامِ تعلیم کی اصلاح
(ج) احیاء الاخلاق
(د) تبلیغ اسلام
(ی) باہمی اختلافات کو دور کرنا
(س) اہل اسلام کی فلاح کی فکر[8]

ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ نے مندرجہ بالا مقاصد کی وضاحت اس طرح کی:

1۔ ندوۃ العلماء کا سب سے بڑا مقصد علما کے درمیان رابطہ قائم کرنا ہے۔ اگر علما ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے واقف ہوں تو قریب آ جائیں، مل کر کام کریں، ان کی اجتماعی قوت بڑھ جائے اور وہ اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے تعمیری کام کر سکیں۔

2۔ دوسرا بڑا مقصد مختلف مسالک کے ماننے والے مسلمانوں کے مابین اختلافات دور کرنا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب علما ایک مسلک کے پیرو ہو جائیں، بلکہ وہ اپنے اختلافی مسائل پر کھلے ذہن سے بحث کریں۔ علاوہ ازیں، مل جل کر اپنے مشترکہ دشمن یعنی یورپی دہریت کا مقابلہ کریں۔

3۔ تیسرا مقصد ہے عربی مدارس میں رائج نصابات کو از سرِ نو تشکیل دینا۔ نئے نصابات

عصرِ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں مرتب کیے جائیں۔ دورِ حاضر کے دہریوں کی تنقید کا جواب دینے کے لیے ایک نئے علم الکلام کی ضرورت ہے۔ عربی ادب اور علومِ قرآن پر بھی زور دینے کی ضرورت ہے۔ کسی تبدیلی کی بنیاد وہی پرانا درسِ نظامی ہی ہوگا، ضرورت ہوئی تو اس میں نئی کتابیں داخل کی جائیں گی اور جن کتابوں کی ضرورت نہ ہوگی انھیں خارج کیا جائے گا۔

4۔ چوتھا مقصد ایک مدرسہ قائم کرنا ہے جس میں طلبا کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جائے گی، تاکہ وہ اپنے اپنے دائرۂ علم میں امتیاز حاصل کر سکیں۔ ندوہ نے یہ مجوزہ مدرسہ قائم کرنے کی ذمہ داری علما کی مجموعی قوت کی بنا پر اس لیے لی ہے کہ اتنے اونچے معیار کا مدرسہ قائم کرنا کسی اور طرح ممکن نہیں ہے۔

5۔ پانچواں مقصد بیرونی ملکوں میں اسلام کی تبلیغ کرنا ہے۔ ندوہ ان لوگوں کے اخراجات اٹھائے گا جو بیرونی ممالک میں مسلمانوں میں یا غیر مسلموں میں تبلیغ کے لیے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو اس ملک کی زبان آنی چاہیے جہاں وہ تبلیغ اسلام کے لیے جائیں۔

6۔ چھٹا مقصد فتویٰ دنیا ہے یعنی دینی یا دنیاوی مسائل پر فقۂ اسلامی کے تحت شرعی حکم دینا۔ ندوۃ العلماء میں دار الافتاء محض لوگوں کی سہولت کے خیال سے کھولا جائے گا، ورنہ کوئی بھی مفتی دینِ عمومی یا خصوصی مسائل پر شرعی حکم صادر کر سکتا ہے[9]۔

پہلے چار مقاصد کا تعلق براہِ راست ان دو عمومی مقاصد سے ہے جن کے تحت ندوۃ العلماء قائم کیا گیا تھا یعنی اصلاحِ نظامِ تعلیم اور مختلف نقطہ ہائے نظر کے علما کے درمیان ربط پیدا کرنا۔ باقی دو مقاصد یعنی پانچویں اور چھٹے مقصد کا تعلق بھی بالواسطہ طور پر انہی دونوں عمومی مقاصد سے ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مقاصد نیز پانچویں اور چھٹے مقاصد ان ہی

عملی کاموں کی بابت ہیں جنھیں بانیانِ ندوۃ العلماء اور ان کے ہم خیال حضرات انجام دینا چاہتے تھے۔

مقصد نمبر 4 یعنی قیام مدرسہ نے بانیانِ ندوۃ العلماء کی تقریباً ساری توجہ اسی طرح اپنی طرف مبذول کرلی جس طرح علی گڑھ تحریک کے بانیوں کی توجہ علی گڑھ کالج کے قیام پر مرکوز ہوگئی تھی۔ جس طرح علی گڑھ کالج ایک تعلیمی منصوبے سے ابھرا تھا،[10] اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی مذہبی تعلیم کے ایک بڑے منصوبے سے نمودار ہوا۔ اس مذہبی منصوبے کی توثیق 24 اپریل 1894 کو ندوۃ العلماء کے اجلاس میں مندرجہ ذیل قراردادوں کی شکل میں ہوئی:

1۔ موجودہ نظامِ تعلیم پرانا ہو چکا ہے، اس میں اصلاح کی فوری ضرورت ہے۔ اس لیے نظامِ تعلیم کی اصلاح کی کوشش کرنا از بس ضروری ہے۔

2۔ اسلامی مدرسوں کے نگرانوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاسوں میں خود یا اپنے نمائندوں کے ذریعے شریک ہوں۔

3۔ اسلامی مدرسوں کی سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کچھ بڑے مدرسوں، جیسے دیوبند، فیض عام اور آرہ کے احمدیہ کو دارالعلوم کا درجہ دیا جائے، اور دوسرے تمام مدارس ان سے الحاق کریں۔

4۔ مدرسہ فیض عام اونچے معیار کا مدرسہ ہے۔ طلبا کی ایک بڑی تعداد اس میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ معقول رہائش کی کمی ان کی تعلیم میں حارج ہے، اور اسی بنا پر وہ آرام سے رہ نہیں پاتے۔ مسلمانانِ ہند کو چاہیے کہ وہ مدرسے کی اقامتی عمارت کے لیے فراخ دلی سے چندہ دیں تاکہ کم از کم دو سو طلبا اس میں رہ سکیں[11]۔

یہ درست ہے کہ مندرجہ بالا قراردادوں میں کہیں بھی ایک نئے دارالعلوم کے قیام کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن اس کے قیام کی تخم ریزی انہی قراردادوں میں ہی کی گئی تھی۔ ایک ایسا ادارہ

جہاں نیا نصاب تعلیم پڑھایا جاسکے تقریباً ناگزیر ہو چکا تھا، کیونکہ اساتذہ ہر چند کہ درسِ نظامی میں اصلاح کی ضرورت کو خاموشی سے مان چکے تھے لیکن بغیر کسی منطقی دلیل کے محض عادتاً اسی کو پڑھائے چلے جارہے تھے۔اس لیے اصلاح شدہ نصاب کا تجربہ کرنے کے لیے ایک دارالعلوم کا قیام ضروری ہوگیا تھا۔

تاریخ

دارالعلوم قائم کرنے کا مسئلہ 1894 میں ہونے والی ندوۃ العلماء کی پہلی مجلس میں پہلے پہل اس وقت زیرِ بحث آیا تھا جب نیا نصاب وضع کرنے کے لیے بارہ افراد کی کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔کمیٹی نے نیا نصاب وضع کرنے کے بجائے دارالعلوم کا منصوبہ تیار کیا تھا[12]۔چنانچہ دارالعلوم قائم کرنے کی قرارداد 1896 میں بریلی میں ہونے والے ندوۃ العلماء کے تیسرے سالانہ جلسے میں پیش ہوئی اور منظور کی گئی۔

اس بارے میں بھی اختلاف پیدا ہوگیا تھا کہ مسودۂ دارالعلوم کے نام سے دارالعلوم کے منصوبے کا خاکہ کس نے تیار کیا تھا۔الہلال کے مطابق یہ خاکہ مولانا شبلی نے تیار کر کے اس دور کے ناظم مولانا محمد علی مونگھیری کے سپرد کر دیا تھا تاکہ وہ اسے اپنے نام سے شائع کروادیں[13]۔ لیکن مولانا محمد علی مونگھیری کے سوانح نگار محمد الحسنی دارالعلوم کے ابتدائی تصور کو اور پھر اس کے منصوبے کے خاکے کو خود مولانا مونگھیری سے منسوب کرتے ہیں[14]۔لیکن حیاتِ شبلی کے اوراق سے ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی نے کئی مرتبہ دارالعلوم کے قیام کی بابت بڑے موثر انداز میں وکالت کی تھی۔

مسودۂ دارالعلوم یا دارالعلوم کے منصوبے کا خاکہ ایک بڑی مکمل قسم کی دستاویز ہے۔وہ ایسے عالم تیار کرنے کی وکالت کرتی ہے جو علم الکلام پر قادر ہوں تاکہ وہ دینِ حق یعنی اسلام کی سچائی ثابت کر سکیں اور مادّی دنیا سے بھی اس قدر واقف ہوں کہ خالص دنیاوی معاملات میں بھی ایک

لائق رہنما بن سکیں۔ اس دستاویز میں اقامتی زندگی کی تفصیلات دی گئی ہیں، ایسی ورزشوں پر زور دیا گیا ہے جیسے تیر اندازی، تیراکی اور گھوڑ سواری، مباحثوں نیز تقریروں کے ذریعے عربی بول چال کی مہارت اور مجمعوں میں تقریر کرنے کی مہارت پیدا کرنے پر توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

ندوۃ العلماء کے پانچویں سالانہ اجلاس میں جو 1898 میں کانپور میں منعقد ہوا تھا ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگھیری نے مجوزہ دارالعلوم کے پہلے سال کے سارے اخراجات کے اہتمام کا مطالبہ کیا تھا۔ ذیل میں پہلے عطیہ کنندگان کے نام اور عطیوں کی رقومات کی فہرست دی گئی ہے۔[15]

1۔ مولوی مسیح الزماں، شاہجہاں پور	100 روپے
2۔ مولوی محمد یونس خاں، دتاولی	100 روپے
3۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی	125 روپے
4۔ مولوی شبلی نعمانی	100 روپے
5۔ مولوی سید محمد علی مونگھیری	50 روپے
6۔ مولوی خلیل الرحمٰن سہارنپوری	50 روپے
7۔ مولوی شاہ عبدالخیر، غازی پوری	50 روپے
8۔ مولوی مشتاق علی، مدرسہ فیض آباد	25 روپے
9۔ مولوی حکیم رونق علی رودولوی	25 روپے
10۔ مولوی محمد داؤد، وکیل مرزاپور	25 روپے
11۔ مولوی مفتی رحم بخش، مدرسہ الموڑہ	25 روپے
12۔ خان بہادر منشی اطہر علی	150 روپے
13۔ مولوی سید اشرف، کانپور	125 روپے

اس اجلاس میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ مجوزہ دارالعلوم لکھنؤ میں قائم کیا جائے۔ دارالعلوم کو دہلی میں قائم کرنے کی تجویز بھی تھی، لیکن یہ تجویز زیادہ نہ چل پائی کیونکہ شرکاء کی اکثریت دارالعلوم لکھنؤ میں قائم کرنے کے حق میں تھی۔ ان کی دلچسپی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ منشی احتشام علی کاکوروی 16 نے پہلے ہی لکھنؤ کے گولا گنج علاقے میں ایک بڑا سا مکان اس کے ہندو مالک سے نو ہزار روپے میں خرید کر ندوۃ العلماء کے نام کر دیا تھا۔ بعد میں اس مکان کا نام خاتون منزل رکھ دیا گیا۔

اسی خاتون منزل میں 26 ستمبر 1898 کو ندوۃ العلماء کے مدرسے کا کام شروع ہوا تھا۔ مدرسے کی افتتاحی تقریب اکتوبر 1898 کو منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب میں علما، وکلا اور تجار کے علاوہ مسٹر گری اور کمشنر مسٹر ہارڈی نے بھی شرکت کی تھی۔

دارالعلوم کی افتتاحی تقریب میں مسٹر گری اور مسٹر ہارڈی کی شرکت سے سرکار کے تئیں ندوۃ العلماء کی مفاہمانہ حکمت عملی کا عندیہ تو ضرور ملتا ہے لیکن کسی معاہدے کا سراغ نہیں ملتا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو سرکار کی طرف سے بغیر کسی بے جا دخل اندازی کے زمین اور مالی امداد بھی ملی۔

ابتدا میں مولانا حفیظ اللہ مدرسے کے مہتمم مقرر کیے گئے تھے، لیکن وہ بغیر اطلاع کے لمبے عرصے تک غیر حاضر رہے، اس لئے مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کو ان کی جگہ مہتمم مقرر کر دیا گیا تھا۔ خاتون منزل میں ریاست جوناگڑھ کے وزیر بہاالدین نے ایک ہال تعمیر کروا دیا تھا۔ اس کے علاوہ مدرسے کی ضروریات کے پیش نظر کچھ کمروں کا بھی اضافہ کیا گیا تھا۔

ندوۃ العلماء کا دفتر 2 ستمبر 1898 کو کانپور سے خاتون منزل، لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ چوبیس دن بعد مجوزہ دارالعلوم ایک معمولی مدرسے کی طرح کام کرنے لگا۔ اسی سال 1860 کے رجسٹریشن ایکٹ کے تحت ندوۃ العلماء رجسٹرڈ بھی ہو گیا۔

جو طلبا 26 ستمبر 1898 کو مدرسے میں داخل کیے گئے انھوں نے اپنی تعلیم کی ابتدائی منزل 1901 میں مکمل کر لی تھی، اور وسطی منزل یعنی درجۂ فاضلیات میں داخل ہو گئے تھے۔ یہی وہ منزل تھی جہاں عربی مدرسوں میں عموماً درسِ نظامی پڑھایا جاتا تھا۔ اس منزل کی تعلیم مکمل کر لینے پر جو سند دی جاتی اسے 'عالم' کہا جاتا تھا[17]۔ گولا گنج کا مدرسہ ایک معمولی سا مکان تھا جو پرانے شہر کی بھیڑ بھاڑ والی گلیوں سے گھرا ہوا تھا۔ بانیانِ مدرسہ چاہتے تھے کہ مدرسہ پرانے شہر کی افراتفری سے دور نظم و ضبط کے ماحول میں واقع ایک دارالعلوم کی طرح پھلے پھولے۔ اس لیے وہ برابر ایک ایسے قطعۂ زمین کی تلاش میں تھے جہاں کی عمارتیں دارالعلوم کے شایانِ شان ہوں۔

اس سے پہلے کہ ندوۃ العلماء کا دفتر لکھنؤ منتقل ہوتا دریادل منشی احتشام حسین کاکوروی نے لکھنؤ کے اپنے قطعاتِ زمین دارالعلوم ندوۃ العلماء کو پیش کر دیے تھے۔ لیکن نامعلوم اسباب کی بنا پر ان کی پیش کش سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ اس کا ایک سبب سرمایے کی کمی بھی ہو سکتا ہے۔

1907 تک پہنچتے پہنچتے ایک بڑی عمارت کی ضرورت بہت بڑھ چکی تھی۔ مولوی غلام محمد شملوی اس درخواست کے ساتھ ریاست بھاولپور بھیجے گئے تھے کہ پچاس ہزار روپے جمع کرنے کے لیے ایسے پچاس اشخاص تلاش کرنے میں ندوہ کی مدد کی جائے جن میں سے ہر شخص ایک ہزار روپے دے سکے۔ نواب بھاولپور کی دادی نے یہ پوری رقم اپنے خزانے سے دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس عطیے نے ان کوششوں پر مہمیز کا کام کیا جو مجوزہ دارالعلوم کے لیے ایک موزوں قطعۂ زمین تلاش کرنے کے لئے کی جا رہی تھیں۔

سب سے زیادہ موزوں زمین گومتی کے دوسرے کنارے پر تھی۔ کیننگ کالج جو بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی بن گیا اس زمین سے بہت قریب تھا۔ یہ بتیس بیگھہ زمین ان عمارت کے لیے کافی تھی جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے تجویز کی گئی تھیں۔

اس زمین کا سالانہ کرایہ دو ہزار روپے تھا۔ لیکن ڈپٹی کمشنر جاپلنگ اور ریاست پٹیالہ کے وزیر عبدالمجید خاں کے بیچ میں پڑنے کی وجہ سے گورنر ہیوٹ نے 1908 میں احکامات صادر کیے کہ زمین ندوۃ العلماء کو ساٹھ روپے سالانہ کے برائے نام کرائے پر دے دی جائے۔

یہ بات ذرا تعجب کی ہے کہ ایک مذہبی تربیت گاہ یعنی دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سنگِ بنیاد ایک عیسائی کے ہاتھوں رکھا جائے۔ اس کے پس پشت ایک عام سا دنیاوی مقصد تھا۔ خیال یہ تھا کہ اگر ندوہ کے بارے میں یہ شک دور کر دیا جائے کہ وہ برطانیہ مخالف ہے تو اودھ کے تعلقدار اور مالدار لوگ دل کھول کر اس کی مالی مدد کریں گے۔ اس لیے عمارت کا سنگِ بنیاد صوبہ ہائے متحدہ کے عیسائی گورنر سے رکھوایا گیا[18]۔ اس فعل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے مولانا شبلی نے لکھا تھا کہ مسجد نبوی کا منبر ایک عیسائی نے بنایا تھا۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں: 'یہ پہلا موقع تھا جب ترکی ٹوپیاں اور صافے ساتھ ساتھ نظر آ رہے تھے، یہ پہلا موقع تھا جب شیعہ اور سنی مل کر ایک مذہبی ادارے کا افتتاح کر رہے تھے، یہ پہلا موقع تھا جب ایک مذہبی ادارے کا سنگ بنیاد ایک غیر مسلم کے ہاتھوں رکھا جا رہا تھا (مسجد نبوی کا منبر ایک نصرانی نے بنایا تھا)'[19]۔

ندوہ کی افتتاحی تقریب 28 نومبر 1908 کو ہوئی تھی اور دوسرے دن سے ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس شروع ہو گیا تھا۔ اس افتتاحی تقریب اور جلسے میں علی گڑھ کے ممتاز ارکان شریک ہوئے تھے۔ افتتاحی تقریب میں نواب وقار الملک، آفتاب احمد خاں، حاجی محمد موسیٰ خاں شریک ہوئے تھے، اور ندوہ کے سالانہ اجلاس میں ڈاکٹر ضیاالدین نے تقریر کی تھی۔ ندوہ کی افتتاحی تقریب میں علی گڑھ کے نمائندوں کی موجودگی کا سبب غالباً مولانا شبلی تھے جن کا ایک مدت سے ان حضرات سے تعلق تھا۔ لیکن گورنر کے ہاتھوں تقریب کا افتتاح اور اودھ کے تعلقداروں اور اشراف کی شرکت بھی تقریب میں ارکانِ علی گڑھ کی موجودگی کا ایک سبب تھی، کیونکہ یہ حضرات بھی اسی طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتے تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عمارات کے ماہر تعمیرات اور نگراں خان بہادر میر جعفر حسین تھے۔ وہ علی گڑھ تحریک میں بھی صفِ اول کے حضرات میں تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا جو نقشہ انھوں نے بنایا تھا اس میں اکتیس (31) کمرے اور ایک مرکزی ہال تھا جس میں ایک ہزار اشخاص بیٹھ سکتے تھے۔ عمارت کا نقشہ 5 مئی 1909 کو مجلس انتظامیہ نے منظور کیا تھا، اور تعمیر کے کام کی نگرانی کے لئے ایک ضمنی کمیٹی بنادی تھی۔ اس کمیٹی کے معتمد منشی احتشام علی کاکوروی تھے۔ تعمیر کا کام اودر سید ہادی کی نگرانی میں شروع ہوا تھا اور 1913 تک برابر چلتا رہا تھا۔

خان بہادر میر جعفر حسین نے جن عمارتوں کا نقشہ تیار کیا تھا وہ ابھی نامکمل ہی تھیں کہ سرمایہ ختم ہوگیا اور 1913 میں سب کام رک گیا تھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء 1914 میں خاتون منزل سے انہی نامکمل عمارتوں میں منتقل ہوا تھا۔ مرکزی ہال جس پر کبھی کبھی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال کا گمان ہوتا ہے، 1910 میں مکمل ہوا تھا۔ آغا خاں کو اسی ہال میں استقبالیہ دیا گیا تھا۔ 1912 میں المنار (قاہرہ) کے مدیر رشید رضا کا خیر مقدم بھی اسی ہال میں کیا گیا تھا۔

نصابات

ندوۃ العلماء کے پہلے سالانہ اجلاس میں جو چار قراردادیں منظور کی گئی تھیں ان میں اصلاحِ نصاب اور عربی مدارس کی تنظیم نو کی قراردادیں بھی شامل تھیں۔ اجلاس کی روداد اس بات کی مظہر ہے کہ ملا نظام الدین نے دو سو سال پہلے جو نصابات مرتب کیے تھے وہ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں اپنی افادیت بہت کچھ کھو چکے تھے۔ ان نصابات کے ذریعے طلبا کو مشکل ہی سے وہ معلومات حاصل ہو پاتی تھیں جو جدید تعلیم یافتہ مسلمان کو مطمئن کر سکے یا وہ دلیلیں اور ثبوت فراہم کر سکے جو اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات کے جواب میں پیش کیے جا سکیں۔

علما جدید علوم کے مواد اور اس کی نوعیت سے واقف نہیں تھے، کیونکہ جدید علوم انگریزی

زبان کے ذریعے ہی حاصل کیے جاسکتے تھے، اس لیے وہ آج کے مسائل سے ہی واقف نہیں تھے چہ جائیکہ ان مسائل کے حل سے۔ عربی مدارس نے اپنے گرد ایک حصار بنالیا تھا، اور اپنے نصابات نیز طریقۂ تدریس میں کسی طرح کی تبدیلی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ایک طرح کا جمود طاری ہوگیا تھا۔

انگریزی اہل برطانیہ کی زبان تھی جنھوں نے مسلمانوں سے عصائے شاہی چھین لیا تھا۔ اس لیے انگریزی زبان کو نظر انداز کرنے کا سبب تو موجود تھا۔ لیکن تاریخ، جغرافیہ اور معاشیات جیسے مفید مضامین بھی عربی مدارس کے نصابات میں کوئی مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے[20]۔

ہندوستان میں مغربی تعلیم اور تہذیب کی آمد نے علما کے لیے ایک بڑا چیلنج پیدا کردیا تھا۔ مغربی تعلیم اور تہذیب نے مسلمانوں کے ممتاز طبقے پر اثر ڈالنا شروع کردیا تھا۔ یہی طبقہ عوام پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس طبقے کو ان بیرونی خیالات کا اثر قبول کرنے سے جو الحاد کی طرف مائل تھے محض لفاظی سے نہیں روکا جاسکتا تھا۔ مزید برآں، مغربی علوم اور انگریزی زبان سے آراستہ عیسائی پادری اسلام اور اس کے ماننے والوں، خصوصاً علما، پر بڑے سخت اعتراضات کرتے تھے۔ اس لیے اب یہ انتہائی ضروری ہوگیا تھا کہ علما اپنی علاحدگی ختم کریں، اپنے حصار سے باہر آئیں، اپنے برداران پر اثر انداز ہونے کے لئے اور اپنے مخالفین سے مسائل پر بحث کرنے کے لیے جو زبان سیکھنا اور جو علم حاصل کرنا ضروری ہو اسے سیکھیں اور حاصل کریں۔

مدرسے کی تعلیم نے ایسے طلبا تیار کرنے کے بجائے جو نئے چیلنجوں کا سامنا کرسکیں ایسے علما تیار کیے تھے جو نہایت بودے قسم کے مسائل پر آپس میں الجھ جاتے تھے۔ وہ ایسے مسائل پر بحث کرتے جو کسی صحت مند معاشرے میں مشکل ہی سے وجۂ نزاع ہوسکتے ہیں، اور اسی لیے مسلمان ان کی وہ عزت وتوقیر نہیں کرتے تھے جو ان کے مرتبے کے شایانِ شان تھی۔ یہی وجہ تھی کہ

اپنے ہم مذہبوں میں ان کا اعتبار اور ان کی قائدانہ حیثیت گرتی جارہی تھی۔

مولانا شبلی کے الفاظ میں: "تقسیم کار کے اصول کے تحت، افراد کے اس طبقے کو جو علما کہلاتا ہے شروع ہی سے قیامِ مذہب، عقائدِ مذہب اور تاریخِ مذہب پر نظر رکھنے کا کام تفویض کیا گیا تھا..... موجودہ حکومت اور یورپی فن وادب کے زیرِ اثر قوم کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب آچکا ہے۔ ان حالات میں کیا وہ علما جو موجودہ حالات اور جدید علوم سے ناواقف ہیں قوم کی رہنمائی (درست خطوط پر) کرسکتے ہیں"[21]۔

اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ علما کی تعلیم میں تبدیلی لاکر ان کی رہبرانِ قوم والی حیثیت بحال کی جائے[22]۔ اور چونکہ تعلیم کا انتہائی اہم جز نصاباتِ تعلیم خیال کیے گئے اس لیے بانیانِ ندوۃ العلماء نے عربی مدارس میں رائج نصاباتِ تعلیم از سرِ نو تشکیل دینے کی لگاتار کوشش کی۔

نئے نصابات تشکیل دینے کے لیے 1894 میں ہی ایک کمیٹی بنادی گئی تھی۔ کمیٹی کے بارہ میں سے ایک ممبر مولانا شبلی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عربی مدارس کے موجودہ نصاب میں معقولات (علومِ حکمت وفلسفہ ومنطق) کی بھرمار ہے۔ الہائیات (وہ علم جس میں خدا کے وجود اور ذات وصفات سے بحث کی جاتی ہے) کے مسائل حل کرنے کے لیے منطق (وہ علم جو عقلی دلائل سے حق اور ناحق میں تمیز کرتا ہے) کا سہارا نہیں لینا چاہیے۔ نصاب میں عربی ادب پر اور زیادہ کتابیں شامل ہونی چاہیے۔ نئے نصاب میں قرآن اور متعلقہ علوم کو مرکزی جگہ دینی چاہیے۔ اس کے علاوہ طریقۂ تدریس میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مروجہ کتابوں کا متن پڑھانے کے بجائے حصولِ علم وفن مقصد ہونا چاہیے۔

ندوۃ العلماء کے 1895 کے لکھنؤ کے اجلاس میں گو عربی مدارس کے نصابات میں جدید علوم شامل کرنے کے حق میں شرکا کی اکثریت تھی، لیکن جدید علوم کی شمولیت کی مخالفت بھی خوب کی گئی۔ اسی اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ عربی مدارس میں مدتِ تعلیم دس برس ہونی چاہیے[23]۔

شرکا نے اعتراف کیا کہ دوسو سال سے جو نصابات رواجاً جاری ہیں انھیں ایک دن میں بدلا نہیں جاسکتا۔ پھر بھی زیادہ تر علما تبدیلیٔ نصاب کی طرف مائل تھے، اور عربی ادب نیز تفسیر کے نصابات میں اضافے کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے، اور چاہتے تھے کہ موجودہ نصاب میں ایک نیا علم کلام شامل کیا جائے[24]۔

1896 میں مولانا محمد علی مونگھیری نے 'مسودۂ نصابِ عربی' کے عنوان سے نصاب کا ایک ابتدائی خاکہ پیش کیا۔ اس مجوزہ نصابِ تعلیم میں کُل بیس مضامین تھے، جن میں سے چھ کے علاوہ باقی سارے مضامین وہی تھے جو عربی مدارس میں پہلے سے پڑھائے جا رہے تھے۔ نئے چھ مضامین یہ تھے: تاریخ، اصولِ لغات، تجوید، عروض، سلوک و تہذیبِ نفس (تصوّف)، اسرارِ احکام۔

مجوزہ نصابِ تعلیم میں مضامین کے تحت کتابیں بھی دی گئی تھیں۔ فلسفہ، منطق، ہیئت (نجوم)، ریاضی، جغرافیہ، کے تحت یا تو کتابیں دی ہی نہیں گئی تھیں یا پھر چند ایک۔ معیشت اور اصولِ سلطنت کے مطالعے کی ضرورت کے باوجود ان مضامین کی کتابیں نہیں دی گئی تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ان مضامین پر اردو میں کتابیں میسر ہی نہ ہوں یا پھر جدید مضامین کو نصاباتِ تعلیم میں شامل کرنے میں آہستہ روی کی جو حکمتِ عملی اپنائی گئی تھی وہ اس کا سبب رہی ہو۔ بہر حال وجہ جو بھی رہی ہو لیکن جدید مضامین کے مطالعے کے لیے موزوں کتابوں کی غیر موجودگی ان مضامین کو دیر سے داخلِ نصاب ہونے کا سبب بن گئی۔ اور اسی لیے عربی مدارس میں بشمول دارالعلوم ندوۃ العلماء وہی پرانے نصاباتِ تعلیم معمولی سی ردوبدل کے ساتھ جاری رہے۔

1896 میں مولانا محمد علی مونگھیری کے مسودے کے علاوہ بیس نصابات کے مسودے اور پیش کیے گئے۔ مسودوں کی اس کثیر تعداد نے جن میں یقیناً بہت کچھ فرق بھی رہا ہوگا ندوۃ العلماء کے کارکنان کو ایسے رہنما اصول وضع کرنے پر مائل کیا ہوگا جن کی مدد سے ایک قابلِ قبول نصاب

تعلیم کے لیے مضامین اور کتابوں کا انتخاب کیا جا سکے۔ چنانچہ 1902 میں ندوۃ العلماء کے امرتسر کے سالانہ اجلاس میں جب دوبارہ نصاباتِ تعلیم زیرِ بحث آئے تو مروجہ درسِ نظامی میں ترمیم کرنے کے خیال سے کچھ رہنما اصولوں پر اتفاق کر لیا گیا۔ ان میں سے ایک اصول یہ طے کیا گیا کہ وہ تمام کتابیں جو علم کے ایک سے زیادہ دائروں کے بارے میں ہوں انھیں نصاباتِ تعلیم سے خارج کر دیا جائے۔ 'اگر اس اصول پر عمل کیا گیا ہوتا تو مندرجہ ذیل کتابیں نصاباتِ تعلیم سے فوراً نکال دی گئی ہوتیں: ملا حسن، میر زاہد، حمد اللہ قاضی'[25]۔ اسی طرح ملا جلال، شرح جامی، فصولِ اکبری، کافیہ، میبذی، شافیہ کو بھی نصاباتِ تعلیم میں شامل رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ لیکن جب یہ بعد والی کتابیں ندوۃ العلماء کے مدرسے میں برابر پڑھائی جاتی رہیں، تو مولانا شبلی نے برہم ہو کر نصابات کمیٹی کے معتمد مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھا '.....کیا ندوہ کا دعویٰ یہ تھا کہ دیوبند کی پرانی عمارت ہمارا کعبہ ہوگی.....'[26]۔

ندوہ کے سالانہ اجلاس میں جو 1904 میں مدراس میں منعقد ہوا، نصاباتِ تعلیم تشکیل دینے کے لیے ایک اور کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی کو ان رہنما اصولوں کو نظر میں رکھنا تھا جن پر امرتسر کے اجلاس میں اتفاق ہوا تھا۔ ملا عبدالقیوم، مولانا عبدالحئی، اور مولانا شبلی اس کمیٹی کے رکن تھے۔ کمیٹی نے بالآخر نصاب مرتب کر دیا، اور اساتذہ کے ابتدائی تذبذب کے بعد اس پر عمل درآمد بھی ہونے لگا۔

نیا نصابِ تعلیم پرانے کے مقابلے میں اس لحاظ سے خاصہ مختلف تھا کہ نئے نصاب میں علم کے مختلف دائروں پر زور دیا گیا تھا، اور مختلف کتابیں انتخاب کی گئی تھیں۔ علوم کے جن دائروں پر زور دیا گیا تھا اور جو کتابیں انتخاب کی گئی تھیں وہ ذیل میں دی جا رہی ہیں:

1۔ عربی ادب اور فن بلاغت پر زیادہ زور دیا گیا۔ پہلے سے مروّج کتابوں میں یہ کتابیں اور شامل کی گئی تھیں: مختصر المعانی، دلائل الاعجاز، اعجاز القرآن، نقد الشعر۔

2- تفسیر بیضاوی کے پندرہ ابواب کے علاوہ ایک مصری مطبوعہ کتاب الصراط المستقیم بھی شامل کرلی گئی تھی۔ اس کتاب میں فقہ، کلام اور اخلاقیات کی تشریح قرآن کی روشنی میں کی گئی ہے۔

3- عقائد کی تعلیم ابنِ رشد کی کتاب کشف الاولیا اور امام غزالی کی کتاب اقتصاد کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ امام غزالی کی کتاب اقتصاد کی جگہ امام رازی کی کتاب معلم فی اصولِ دین تجویز کی گئی تھی۔

4- فلسفے کے نصاب میں ہدیہ سعیدیہ، شرح حکمت العین، شرح حکمت الاشراق شامل کی گئی تھیں۔

5- اسرارِ شریعت کے نصاب میں شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ شامل کی گئی تھی۔

6- فلسفۂ جدید کے نصاب میں دروس الاولیا شامل کی گئی تھی۔ اس کتاب میں وہ مسائل درج ہیں جو سائنس کے ظہور کی بنا پر معاشرے کو درپیش ہیں۔ یہ کتاب بیروت میں شائع ہوئی تھی [27]۔

مندرجہ بالا نصاباتِ تعلیم جن میں انگریزی زبان کی لازمی تعلیم بھی شامل تھی ندوۃ العلماء کے کارکنان نے 1904 میں منظور کر لیے تھے۔ لیکن 1905 تک جب تک مولانا شبلی معتمدِ تعلیم نہ بنائے گئے یہ نصاباتِ تعلیم روبہ عمل نہ لائے جاسکے۔ انھوں نے ان پر عمل درآمد کرانے میں قدرے سختی برتی تھی۔

نصاب میں انگریزی زبان کا لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ مولانا محمد علی مونگھیری اور مولانا شبلی دونوں ہی آئندہ کے علما کو انگریزی پڑھانے کے حق میں تھے تاکہ وہ اپنی تبلیغی سرگرمیاں انگریزی داں لوگوں تک پھیلا سکیں [28]۔ لیکن بانیانِ ندوۃ العلماء کی خاصی بڑی تعداد اس حق میں نہیں تھی کہ انگریزی زبان کو نصاباتِ تعلیم میں کوئی بھی

جگہ دی جائے۔ بہر حال، 1900 میں دارالعلوم کی مجلس انتظامیہ نے انگریزی زبان کو اختیاری زبان کی حیثیت سے پڑھائے جانے کی منظوری دے دی۔ 1902 میں انگریزی کو دوسری زبان کا درجہ دے دیا گیا، اور 1905 میں جب مولانا شبلی معتمدِ تعلیم بنے تو اس کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ مولوی ظہور احمد بی، اے، کو دارالعلوم کی مجلس انتظامیہ کا رکن نامزد کیا گیا تا کہ انگریزی زبان کی تدریس کی نگرانی میں وہ زیادہ موثر طور سے مدد کر سکیں۔

دارالعلوم میں انگریزی زبان کی تعلیم کو ایک اور محرک اس وقت ملا جب صوبہ ہائے متحدہ کی سرکار نے دارالعلوم میں سیکولر مضامین پڑھانے کے لیے پانچ سو روپے ماہوار عطا کرنے کی منظوری دی۔ دارالعلوم نے اس عطیے کو اس شرط پر قبول کیا کہ سرکار اس کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے گی۔

1909 میں دارالعلوم کی مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے تحت علمِ کلام اور عربی ادب میں درجاتِ تکمیل شروع کیے گئے۔ 1912 میں تفسیر میں بھی درجاتِ تکمیل شروع ہو گئے۔ مختلف درجاتِ تکمیل کے لیے ذیل کی کتابیں منظور کی گئیں:

علم کلام:

شرح مقاصد علامہ تفتازانی، امام غزالی اور ابنِ رشد کی تہافتہ، کتاب الصفات امام بیہقی، رسائل الاربعہ امام غزالی، بحث عصمتِ انبیاء از الملل والنحل ابن حزم، تلخیص المقال وکشف الاولی ابن رشد، اظہار الحق، حدیقہ فکریہ، کتاب الروح ابن القیم، ستیارتھ پرکاش۔

علم ادب:

دیوان امراء القیس، نابغہ ذبیانی، القصائد العشر، موازنہ ابو تمام وبحتری، عروۃ بن الورد و فرزدق، العقد الفرید ابنِ عبد ربہ، کتاب الصنعتین ابو ہلال عسکری، اسرار البلاغۃ عبد القاہر جرجانی، مشقِ نظم ونثر۔

علمِ تفسیر:

تفسیر ابنِ کثیر، بیضاوی، کشاف، کتاب الناسخ والمنسوخ للنحاص، الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی، اعجاز القرآن للباقلانی، تفسیراتِ احمدیہ، ملاجیون۔

فقہ اور اصولِ فقہ:

تحریر ابنِ ہمام، مسلم الثبوت ملا محب اللہ، معانی الآثار امام طحاوی، بدایۃ المجتہد قاضی ابن رشد [29]۔

30 جون 1909 کو مجلسِ انتظامیہ نے جب علمِ کلام اور علمِ ادب میں درجات تکمیل کی منظوری دی [30] تو ندوۃ العلماء نے علومِ اسلامی کے مختلف شعبوں میں خصوصی تعلیم شروع کر دی۔ اس وقت تک عربی مدارس میں ایک عام انداز کی مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ ندوۃ العلماء کے 1895 کے دوسرے ہی سالانہ اجلاس میں، جس میں مدرسے کی مدتِ تعلیم دس سال طے ہوئی تھی، خصوصی تعلیم کی ضرورت زیرِ بحث آئی تھی۔

ان دس سالوں کو، ابتدائی کے تین سال، وسطی منزل کے پانچ سال یعنی فضیلت، اور پھر اعلیٰ تعلیم کے دو سال یعنی تکمیل، میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان منازل کو کامیابی سے طے کرنے والے طلبا کو بالترتیب مفسر، فقیہ، اور محدث کہا جاتا تھا۔ آج دس برسوں کی جو تقسیم ندوہ میں ہے وہ اس تقسیم سے مختلف ہے جو پہلے تجویز ہوئی تھی۔ موجودہ تقسیم میں پہلے پانچ سال ابتدائی کے، پھر دو سال متوسط کے، اور مزید تین سال ثانوی کے ہیں۔

1908 میں تدریسِ ہندی اور سنسکرت شامل کیے جانے سے نصاباتِ تعلیم میں ایک اور اہم اضافہ ہوا۔ اس اضافے کا اولین سبب اسلام پر آریہ سماجیوں کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے ان کی زبانوں اور ان کے ادبی سرمایے سے واقف کرانا تھا۔ لیکن یہ اضافہ عارضی ثابت ہوا اور ندوۃ العلماء سے مولانا شبلی کے استعفے کے بعد جاری نہ رکھا جا سکا۔ بہر حال، ہندی

موجودہ نصاباتِ تعلیم میں دوبارہ شامل ہوگئی ہے، اور ابتدائی کے موجودہ چھ سالوں میں سے آخری چار سالوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف انگریزی کی تعلیم ابتدائی کی چوتھی جماعت سے پانچ سال تک جاری رہتی ہے جس میں متوسط کے دو سال بھی شامل ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں مضامین (یعنی ہندی اور انگریزی) جن میں سے اول الذکر مضمون نصاب میں خاصے عرصے تک شامل نہ رہا، موجودہ نصابِ تعلیم کے جز بنے ہوئے ہیں۔

دارالعلوم کے نصاباتِ تعلیم پر مولوی سید علی حسن خاں اور سید عبدالعلی کے دورِ نظامت میں متعدد بار نظرِ ثانی کی جا چکی ہے [31]۔

مندرجہ بالا اصلاحات جو 1923 اور 1931 کے آس پاس کی گئی تھیں، اور ان کے بعد کی اصلاحات نیز نصابات کی تنظیمِ نو، کا بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ اگر دینیات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اصلاح شدہ نصابِ تعلیم درسِ نظامی کے اور زیادہ قریب آ گیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اب جو نصاباتِ تعلیم جاری ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(1) اسکول کا دس سالہ کورس جسے ثانوی کہا جاتا ہے، اور (2) ثانوی پاس کرنے کے بعد مندرجہ ذیل چار سالہ کورسز: (ا) شریعت اور اصولِ دین، (ب) لغات العربیہ و ادبیہ، (ج) دعوت و فکرِ اسلامی۔ پہلے دو کورس کے شعبے، شعبہ جات (فیکلٹی) شریعت و اصولِ دین اور شعبہ جات (فیکلٹی) لغات العربیہ و ادبیہ ہیں جب کہ تیسرا کورس دعوت و فکرِ اسلامی اعلیٰ ادارے میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس بات کو دھیان میں رکھا جائے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اب فیکلٹی (شعبہ جات) کا نظام اپنا لیا ہے۔ مندرجہ بالا تینوں میں سے کوئی ایک کورس پورا کرنے کے بعد عالمیت کی سند دی جاتی ہے، جو عربی میں 'لسان' کہلاتی ہے، اور دوسری یونیورسٹیوں کے بی۔اے کے برابر خیال کی جاتی ہے۔

عالم بننے کے بعد طالبِ علم فاضلیت کے کورسوں میں داخلہ لے سکتا ہے، جو دونوں

فیکلٹیوں میں اور دعوت وفکرِ اسلامی کے اعلیٰ ادارے میں پڑھائے جاتے ہیں۔ فاضلیت کا کوئی کورس کامیابی سے پورا کرنے کے بعد سندِ فاضلیت دی جاتی ہے جسے عربی میں بجستائر کہا جاتا ہے، اور جو دوسری یونیورسیٹوں کے ایم۔اے کے برابر خیال کی جاتی ہے [32]۔ (جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سندِ عالمیت اور سندِ فاضلیت کو بی، اے، اور ایم، اے، کے برابر مانا جاتا ہے)۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کورسوں کو کچھ اور یونیورسٹیوں میں بھی مانا جاتا ہے جہاں اسلامی علوم کے کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خصوصیات

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ ندوۃ العلماء کا عام مقصد مسلم افراد اور ان کی جماعتوں کے درمیان تفرقات کو دور کرنا، اور مقصدِ خاص مختلف مسلکوں کے علما کے درمیان اختلافات کو دور کرنا تھا، اور عربی مدرسوں کے نظامِ تعلیم خصوصاً ان میں رائج نصاباتِ تعلیم کی اصلاح کرنا تھا۔

قیاس یہ تھا کہ علما کے سابقہ اختیار اور قیادت کو بحال کرنے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مروجہ نصاباتِ تعلیم تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں اگر علما حکومت پر اثر نہ بھی ڈال سکتے ہوں، تو مذہبی قائدوں کی حیثیت میں کم از کم مسلمانوں کی سماجی اور مذہبی زندگی میں ایک نہایت اہم رول ادا کرسکتے تھے۔ اب ان کا فرض تھا کہ وہ اسلام کو اس الحاد سے بچائیں جو دنیا کے تقریباً سارے ہی مذاہب کے لیے خطرہ بن چکا تھا [33]۔

بانیانِ ندوۃ العلماء کی توجہ نصاباتِ تعلیم پر اس قدر مبذول ہوئی کہ تقریباً اکیس علما نے اکیس نصاباتِ تعلیم تیار کیے، لیکن 1905 سے پہلے کسی پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ بانیانِ ندوۃ العلماء کے درمیان بعض نکات پر اختلافات تھے، اسی وجہ سے تبدیل شدہ نصابات میں سے کوئی بھی نصاب سات سال تک نافذ نہیں کیا جاسکا۔

ان نکات میں سے ایک نکتۂ اختلاف عربی مدارس میں جدید مضامین کا شامل کرنا تھا۔

'جدید مضامین' کی اصطلاح سے سائنس کے مضامین جیسے علم حیوانیات، علم نباتیات، علم طبیعیات اور علم کیمیا ذہن میں آتے ہیں۔ لیکن یہ اصطلاح غالباً کبھی بھی سائنس کے مضامین کے لیے استعمال نہیں کی گئی، بلکہ غالباً یہ ہمیشہ ہی تاریخ، جغرافیہ، سیاسی اقتصادیات یعنی لبرل آرٹس کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ لیکن لبرل آرٹس کا دائرۂ عمل بھی مسلمان ملکوں میں مسلمانوں کے کارناموں تک محدود کرلیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر دارالعلوم کے موجودہ نصاب تعلیم میں جغرافیہ کا علم مسلمان ملکوں اور جزیرہ نما عرب کے جغرافیائی حصوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح دارالعلوم میں تاریخ کا مطالعہ اسلامی تاریخ اور تہذیب پر مشتمل ہے۔ اقتصادیات، سیاسیات اور معلومات عامہ کے موجودہ کورسوں کے عنوانات کے انتخاب اور ان کی تنظیم کے بارے میں بھی انہی اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے جن کے تحت تاریخ اور جغرافیہ کے عنوانات کا انتخاب کیا گیا ہے، اور ان کی تنظیم کی گئی ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصابات تعلیم میں انگریزی زبان کی شمولیت ایک اور متنازع فیہ چیز تھی جس پر آسانی سے فیصلہ نہ ہوسکا تھا۔ حالانکہ علما خوب واقف تھے کہ انیسویں صدی کے مسلم دائرۂ تعلیم میں مذہبی حملوں اور جوابی حملوں کی گنجائش رکھنا ضروری تھا، اور اس بنا پر انگریزی زبان جاننا بھی ضروری تھا، لیکن ان کا یہ شک ابھی تک دور نہ ہو پایا تھا کہ انگریزی زبان کی تعلیم سے الحادی خیالات ذہنوں میں در آئیں گے۔ اسی لیے وہ انگریزی زبان کے مطالعے کے بارے میں مذبذب تھے۔ مولانا شبلی جیسے حضرات کو یقین تھا کہ آج کے عالم کو یورپ میں تبلیغ اسلام کے لیے، اور اپنے نقادوں سے موثر انداز میں اسلام کی مدافعت کے لیے، انگریزی زبان جاننا نہایت ضروری تھا۔ لیکن مولانا شبلی نے جن کو انگریزوں کے درمیان اور ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تھا، جن میں 'پریچنگ آف اسلام' کے روشن خیال مصنف پروفیسر آرنالڈ بھی شامل تھے، اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں بڑی حد تک غیر ذمہ دارانہ برتاؤ کا ثبوت دیا تھا[34]۔

انگریزی کی حیثیت بہر صورت بڑھتی گئی، کبھی تو حکومت کی بالواسطہ سرپرستی سے، اور کبھی ان پابندیوں کی بنا پر جو شہر کی سماجی فضا وقتاً فوقتاً خود عائد کرتی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ثانوی درجات کے موجودہ نصاب میں درجہ چہارم سے درجہ دہم تک انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ اور چونکہ دوسری یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے انگریزی معیار کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے ندوہ میں بھی انگریزی کے معیار کو قدرے بہتر بنالیا گیا ہے۔ اس سب کے باوجود ندوہ میں انگریزی کی تعلیم ان دوسرے اسکولوں کے معیار کی نہیں ہے جہاں انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔

عربی مدارس میں مروّج نصاباتِ تعلیم عموماً علم کے تین بڑے دائروں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ پہلے دائرۂ علم میں وہ کتابیں آتی ہیں جن کا تعلق دینیات سے ہے۔ دوسرے دائرۂ علم میں وہ کتابیں آتی ہیں جن کا تعلق ادب، خصوصاً عربی ادب، سے ہے۔ تیسری قسم ان کتابوں کی ہے جو معقولات سے تعلق رکھتی ہیں یعنی فلسفہ، منطق وغیرہ سے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دینیات کا نصابِ تعلیم درسِ نظامی سے اسی قدر قریب ہے جتنے دوسرے عربی مدارس کے نصاباتِ تعلیم۔ ندوہ میں اصولِ حدیث، اصولِ فقہ، اصولِ تفسیر کی مستند کتابوں کے علاوہ صحاح ستہ، مشکوٰۃ، ہدایہ بھی پڑھائی جاتی ہیں، کچھ اور نئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جیسے شاہ ولی اللہ کی شرح العقائد الحسنہ اور الفوز الکبیر[35]۔

معقولات پر جتنی توجہ اب دی جارہی ہے وہ پہلے سے کہیں کم ہے۔ اس کمی کا اصل سبب یہ ہے کہ اب اس کی جگہ عربی ادب کا نصاب بڑھ گیا ہے اور لامحالہ اس پر زیادہ توجہ درکار ہے۔ فلسفہ اور منطق کے کورس مختصر ہیں اور ہر کورس کو پورا کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی کتاب مختص کی گئی ہے۔ معقولات کے نام سے بس اتنا ہی کورس دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصابِ تعلیم میں شامل ہے۔

ایسا لگتا ہے جیسے دارالعلوم کے نصابِ تعلیم کا نمایاں وصف عربی ادب کی تعلیم ہے۔ عربی ادب کے کورس میں درسِ نظامی کی ساری متعلقہ کتابیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور

کارآمد کتابیں بھی شامل ہیں جیسے مختارات من آداب العرب، منثورات من آداب العرب، الاداب العربی بین الارض و نقد [36] وغیرہ۔ عربی ادب کے کورس میں نثر و نظم کی مستند کتابیں تو شامل ہیں ہی خود ادارے نے بھی عربی زبان کی دستی کتابیں تیار کی ہیں تاکہ طلبا کو زبان سے واقفیت بڑھانے میں سہولت ہو۔

عربی زبان اور ادب پر زور دینے کی وجہ سے طلبا کو عربی بولنے اور لکھنے کی خوب مہارت ہو جاتی ہے۔ اس طرح بانیانِ علی گڑھ کالج کے اس اعتراض کو ندوۃ العلماء نے دور کر دیا ہے کہ برسوں عربی زبان و ادب میں تعلیم دینے کے باوجود عربی مدارس طلبا میں عربی لکھنے اور بولنے کی کافی مہارت پیدا نہیں کر پاتے۔

شروع میں عربی زبان و ادب پر زور دینے کا اولین مقصد قرآن اور اسلامی علوم کا بہتر ادراک پیدا کرانا تھا۔ لیکن بدلے ہوئے حالات میں جب عرب دنیا میں روزگار کے دروازے کھل گئے ہیں عربی زبان کی مہارت خالص مادّی فائدوں کے پیشِ نظر ایک مفید مطلب اثاثہ بن گئی ہے۔

یہ درست ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے نصابات طلبا کو سرکاری اور نجی دفاتر میں کوئی تنخواہ دار منصب دلانے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن یہ نصاباتِ تعلیم اور ندوہ کا شہری ماحول، جو اتفاقی طور پر منجملہ اور باتوں کے اعلیٰ تعلیم کی بابت مفید معلومات فراہم کرتا رہتا ہے، ایک طرف طلبا کو اپنے اطراف کی دنیا سے واقف کرا دیتا ہے اور دوسری طرف جدید یونیورسٹیوں میں داخلے کے محدود مواقع سے فائدہ اٹھانے میں ان کی مدد کرتا ہے۔

اس بات کا اعتراف بہر حال کرنا پڑے گا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے ایسا نصابِ تعلیم وضع کرنے کی کوشش کی تھی جس میں نئی تعلیم کے وافر عناصر موجود ہوں۔ یہ نئے عناصر جدید دنیا کا بہتر ادراک کرانے کے لیے، اور اسلام کے دفاع، خصوصاً یورپین افراد کے اعتراضات کا

جواب دینے کے لیے اشد ضروری تھے۔ ندوہ ابتدا ہی سے خوب جانتا تھا کہ اس کی تعلیم کا مقصد طلبا کا تنخواہ والے مناصب دلانا نہیں تھا۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ندوہ اپنے عمومی اور خصوصی مقاصد حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ایک اور مقصد علما کے درمیان مذہبی معاملات پر باہمی اختلافات کو دور کرنا تھا۔ ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں ایسے بہت سے علما شریک ہوتے تھے جن کے نکتہ ہائے نظر ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اہلِ حدیث میں مولوی ابراہیم آرادی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ عالم مولوی غلام الحسنین کنتوری اور بہت سے حنفی علما نے ندوۃ العلماء کے پہلے سالانہ اجلاس میں شرکت کی تھی [38]۔

ندوۃ العلماء کی تنظیم میں پہلی دراڑیں اس وقت پڑیں جب احمد رضا خاں بریلوی، مولانا عبدالقادر بدایونی اور مولانا نذیر احمد خاں رامپوری نے ندوۃ العلماء کو شیعوں، نیچریوں (سرسید کے احباب) اور وہابیوں کا آمیزہ قرار دیا۔ مولوی غلام حسین کنتوری کی 1894 کے پہلے اجلاس کی تقریر کو سنی علما نے پسند نہیں کیا تھا، پھر بھی ان کو مجلس نصاب کے بارہ ارکان میں شامل کیا گیا تھا۔ مولانا جلد ہی ندوۃ العلماء سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

لیکن ندوۃ العلماء کے زیرِ اثر بہت سے علما نے انفرادی طور پر اپنے اختلافات دور کر لیے تھے [39]۔ گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ندوۃ العلماء افراد یا جماعتوں کی سطح پر اس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، لیکن علما اس بات سے خوب آگاہ ہو گئے کہ تعاون مقابلے سے کہیں بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبا میں نرمیٔ گفتار اور دوسروں کے نکتۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش جیسی خصوصیات دیکھنے میں آتی ہیں۔

ندوۃ العلماء ایک ایسے وقت قائم ہوا تھا جب برطانوی سامراج کے غلبے کے تحت مغربی تعلیم و تہذیب چیلنج بن چکی تھی اور عیسائی پادریوں کی تبلیغی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں۔

ادھر آریہ سماجی بھی طرح طرح کے مسائل اٹھا رہے تھے، اور علما ان سے مناظرے کے لیے ہر دم تیار رہتے تھے۔ نئے علمِ کلام کی تلاش اور ندوہ کے نصاب میں پہلے انگریزی اور پھر سنسکرت اور ہندی کی شمولیت اسلام کے دفاع اور اس کی حمایت کے مظہر ہیں تاکہ ان کی مدد سے پادریوں سے، جنھیں فرماں رواؤں کی مدد حاصل تھی، اور ہندو افراد کی اس جماعت سے جس نے حال ہی میں مذہب تبدیل کروانے کی کارروائیاں شروع کی تھیں، مقابلہ کیا جاسکے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کو دوسرے عربی مدارس کے مقابلے میں، جن میں دارالعلوم دیوبند بھی شامل ہے، ایک ایسی حکمتِ عملی تیار کرنے کی بڑی فکر تھی جس کے تحت اسلام پر ہونے والے حملوں کا اطمینان بخش جواب دیا جاسکے۔ مولانا محمد علی مونگھیری نے عیسائی پادریوں سے اکثر مناظرے کیے تھے، اور عیسائی عالم عام طور پر جو الزامات اسلام پر لگاتے تھے ان کی تردید میں کتابیں لکھی تھیں[40]۔ مولانا شبلی گو مناظروں میں شریک نہیں ہوئے لیکن اپنی تحریروں میں ان الزامات کی تردید کرتے رہتے تھے جو عام طور سے اسلام پر لگائے جاتے تھے[41]۔ وہ اسلام کے محض دفاع سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ علما کو علوم اور زبان سے لیس کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اسلام کا پیغام یورپ تک پہنچا سکیں۔ دعوت و فکرِ اسلامی کے اعلیٰ ادارے کا قیام اسلام پر ہونے والے حملوں اور جوابی حملوں والی اسی حکمتِ عملی کا مظہر تھا۔

ان چاروں اداروں میں سے جو اس کتاب میں زیرِ مطالعہ ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء شاید وہ واحد ادارہ تھا جس کا قیام کسی اہم سیاسی واقعے کا مرہونِ منت نہیں تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ سنجیدگی سے اصلاحِ نصاب جیسے تعلیمی کاموں میں سرگرم رہا تھا۔ لیکن وہ بالائی ہندوستان میں پیش آنے والے سیاسی واقعات سے خود کو پوری طرح علاحدہ نہ رکھ سکا تھا۔

1900 وہ برس تھا جب صوبہ ہائے متحدہ کے لیفٹیننٹ گورنر، سر انٹونی میکڈونل، نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے عدالتوں میں ناگری رسم الخط کے استعمال کی اجازت دے دی تھی۔

فرمان جاری ہونے سے پہلے کا اور اس کے بعد کا زمانہ وہ تھا جب میکڈونل کا ذہن مسلمانوں اور علما کے خلاف ہر بات یقین کرنے کو تیار تھا۔ یہی وہ زمانہ بھی تھا جب ندوۃ العلماء مسلمان عوام میں کسی حد تک مقبول ہو چکا تھا، اور اسی بنا پر صوبہ ہائے متحدہ کے سرکاری حلقوں میں تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ ملک میں سیاسی عمل، خصوصاً انتہا پسندوں کی سرگرمیاں، برطانوی انتظامیہ کے لیے مزید تشویش کا باعث تھیں۔ شک وشبہ کے اس ماحول میں منشی اطہر علی کے حریف چودھری نصرت علی نے ندوۃ العلماء کی مفروضہ سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں میکڈونل کے ذہن میں جو شبہات پہلے سے موجود تھے ان میں اور اضافہ کر دیا[42]۔

منشی اطہر علی نے اسی میں عافیت سمجھی کہ برطانوی ہندوستان کی حدود سے نکل جائیں۔ وہ پہلے حیدرآباد اور پھر مدینہ منورہ گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ مولانا شبلی سیاست میں میانہ رو تھے لیکن کانگریس کے حامی تھے، اس لیے وہ بھی حیدرآباد رخصت ہو گئے۔ لیکن متعلقہ لٹریچر سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ندوۃ العلماء کے بارے میں میکڈونل کے شبہات محض واہمے پر مبنی تھے۔

حکومت اور ندوۃ العلماء کے درمیان تعلقات اس وقت دوبارہ معمول پر آ گئے جب حکومت نے مجوزہ دارالعلوم کے لیے ایک قطعۂ زمین عطیہ کیا اور مولانا شبلی نے حکومت کی ستائش کی[43]۔ یہ تعلقات اس وقت ایک نئی بلندی تک پہنچ گئے جب اس اسلامی مدرسے کا سنگِ بنیاد عیسائی لیفٹیننٹ گورنر نے رکھا۔ مولانا شبلی نے بڑے جوش کے ساتھ لکھا تھا کہ 'مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کا منبر ایک عیسائی' نے بنایا تھا[44]۔ ایسے موقعوں پر مولانا میں سرسید کی روحِ عمل عود کر آتی تھی۔

اگست 1919 میں صوبہ ہائے متحدہ کی سرکار نے ندوۃ العلماء کو ٹیلے والی مسجد کے پاس منتقل کرنے، اور اس کا علاقہ نیز عمارتیں چھتری کالج کو دینے کی تحریک کی۔ سرکار نے اپنے خرچے سے عمارتیں بنوانے اور طلبا کے لئے اقامت گاہ بنوانے کے واسطے مزید تیس ہزار روپے دینے کی پیش کش کی۔ اس زمانے میں جب ملک کا سیاسی ماحول گرمایا ہوا تھا سرکار کی تجویز کو رد کرنا خاصہ

مشکل فیصلہ تھا۔ لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عہدیداران نے سرکار کی تجویز کو قطعاً نامنظور کر دیا۔ روحِ عدم تعاون وتحریکِ خلافت، خواہ کتنی ہی دبی چھپی رہی ہو، عین ممکن ہے اس فیصلے پر اثر انداز ہوئی ہو۔

ادارہ، بہر حال، ذمہ داری کے ساتھ تعلیم دیتا رہا۔ مولانا محمود حسن، مولانا عبید اللہ سندھی یا مولانا حسین احمد مدنی جیسی قد آور شخصیتیں دیوبند سے تو نکلیں ندوہ سے نہ نکلیں۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ فکری اعتبار سے ندوہ علی گڑھ سے زیادہ قریب تھا۔ جس طبقے نے علی گڑھ کو قائم رکھا اسی طرح کے طبقۂ اشخاص نے ندوہ کو قائم رکھا۔ ندوہ کبھی علی گڑھ کا حریف نہ رہا[46]۔ ندوہ اور علی گڑھ تحریکیں ایک کُل کے دو جز تھے۔ مسائل کو حل کرنے کا انداز، تنظیم ادارہ اور سماجی ماحول کے اعتبار سے ندوہ خاصہ علی گڑھ جیسا تھا۔ دونوں میں فرق تھا تو اس قدر کہ کس بات پر کتنا زور دیا جائے۔ ندوہ نے مذہبی تعلیمات پر بہت زور دیا لیکن نصاب میں لبرل آرٹس کو بھی رکھا۔ علی گڑھ نے جدید تعلیم پر زور دیا، دینیات کا نصاب تیار کیا، اور اسے جاری رکھا۔

حوالہ جات

1۔سرسید(ترقی تعلیم مسلمانان)،تہذیب الاخلاق(تدوین)فضل الدین کاکازئی،صفحہ 457

2۔طفیل احمد،مسلمانوں کا روشن مستقبل،پانچویں اشاعت،مطبع علیمی،دہلی،1945،ص216

3۔سعید اکبرآبادی،دیوبند اور علی گڑھ،علی گڑھ تحریک،1962،صفحہ 224

4-Shan Mohammad, Aligarh Movemnt, Vol.III,
Meenakshi Prakashan, Meerut, 1978, p. 849

5۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ،12 فروری 1895،(نویں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی روداد، 1894)

6۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ،12 فروری 1895

7۔ندوۃ العلماء کی روداد،حصہ اول،1894،انتظار پریس،کانپور،صفحات 23،24

8۔دستور العمل ندوۃ العلماء،دفعہ 4،صفحہ 2،ندوۃ العلماء کی 1915 کی روداد میں شامل ہیں، شاہی پریس،لکھنؤ

9۔ارکانِ انتظامیہ،ضوابط ندوۃ العلماء،اسلامی پریس،کانپور،صفحات 2 تا 7

10۔سید احمد،ترقی تعلیم مسلمانان،مقالاتِ سرسید،جلد 22،(تدوین)مولانا محمد اسماعیل پانی پتی،مجلس ترقی ادب،لاہور،صفحات 82 تا 86

11۔سید سلیمان ندوی،حیاتِ شبلی،(دارالمصنفین،اعظم گڑھ)،صفحات 307 تا 309

12۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 310

13۔الہلال (کلکتہ)، جلد چار (1914)، صفحہ 177 (ڈاکٹر محمد اقبال انصاری نے اپنے مضمون بعنوان، ندوۃ العلماء۔ایک دینی اور تعلیمی تحریک میں حوالہ دیا ہے)، اسلام اور عصر جدید، اپریل 1975، نئی دہلی، صفحہ 42

14۔سید محمد الحسنی، سیرت مولانا سید محمد علی مونگھیری، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1964، صفحہ 146

15۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 317

16۔منشی احتشام علی منشی امتیاز علی کے بیٹے تھے۔منشی امتیاز علی ریاست بھوپال میں وزیر تھے۔ منشی احتشام علی اپنی آخری عمر تک ندوۃ العلماء کی مالیات کے نگراں رہے۔ان کے بیٹے منشی احترام علی بھی اسی منصب پر فائز رہے۔اب احترام علی کے بیٹے اشتیاق علی شوریٰ کے رکن ہیں۔

17۔ندوۃ العلماء کی روداد، 1910، مطبع احمدی، علی گڑھ، صفحہ 87

18۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 481

19۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 842

20۔مولوی محمد حسین، بالانتظیم لنظام التعلم وتعلیم، مطبع انوار احمد، الہ آباد، 1312ھ، صفحات 21تا24

21۔ندوۃ العلماء کی روداد، 1910، متذکرہ بالا روداد، صفحہ 84

22۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 391

23۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 309تا311

24۔سید محمد الحسنی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 138

25۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 394

26۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 392

27۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 414، 415

28۔حیاتِ شبلی صفحات 415، 416 اور سیرت مولانا محمد علی مونگھیری، صفحہ 194 دیکھیے ان کے حوالے پہلے دیے جا چکے ہیں۔

29۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 428 تا 430

30۔ندوۃ العلماء کی روداد، 1910 متذکرہ بالا روداد، صفحہ 94

31۔مولانا عبدالسلام قدوائی، ندوۃ العلماء کے پچیس سال، دفترِ اجلاس، ندوۃ العلماء لکھنؤ، 1975، صفحات 17 تا 19

32۔نصابِ تعلیم ابتدائی، متوسط، ثانوی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، نظامی پریس لکھنؤ، 1980

33۔مولوی ابومحمد ابراہیم، مضامین اربعہ، المطابع لکھنؤ، صفحات 1 تا 3

34۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 638

35۔تعمیرِ حیات، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جاری نصابِ تعلیم، اپریل 25، 1984

36۔تعمیرِ حیات، متذکرہ بالا مضمون

37۔ندوۃ العلماء کی روداد، 1895، المطابع لکھنؤ، صفحات 7 تا 14

38۔حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، استاذ العلماء، معارف پریس، اعظم گڑھ، صفحہ 24

39۔ندوۃ العلماء کی روداد، 1895، المطابع لکھنؤ، صفحہ 90

40۔محمد الحسنی، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 46 تا 60

41۔سید سلیمان ندوی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 35

42۔مولانا عبدالسلام قدوائی، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 8، 9، سید سلیمان ندوی متذکرہ بالا

کتاب، صفحہ 352 بھی دیکھئے۔

43۔ الندوہ، جلد پانچ، نمبر 7، اگست 1908

44۔ الندوہ، جلد پانچ، نمبر 11، دسمبر 1908

45۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حیاتِ عبدالحی، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1970ء، صفحات 187،186

46۔ M.S. Jain, The Aligarh Movement, Shri Ram Mehra & Co., Agra, 1965, p. 71.

مصنف کا خیال ہے کہ ندوہ علی گڑھ کا حریف تھا۔

باب پنجم

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

1904 میں جب جاپان نے روس کو شکست دے کر یورپین افواج کے ناقابلِ شکست ہونے کے فرضی تصور کو ختم کر دیا تو ایشیا اور افریقہ کے ان بہت سے ملکوں میں آزادی کی امید جاگ اٹھی جو یورپین قوتوں کی نو آبادی بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان بھی ان میں سے ایک ملک تھا، اور شاید سب سے بڑی برطانوی نو آبادی۔

1905 میں جب تقسیمِ بنگال کی بنا پر ہندوستان کے لوگوں نے احتجاجی سیاست کا حربہ استعمال کیا، جس کے نتیجے میں 1911 میں بنگال از سرِ نو متحد ہو گیا، تو بہت سے لوگوں نے اس نئے حربے۔ احتجاج۔ کی مدد سے برطانوی سامراج کا جوا اتار پھینکنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

1911 میں ایک یورپین قوت، اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ 13-1912 میں ترکی اور یونان کے درمیان بلقان کی جنگیں لڑی گئیں، جن میں برطانیہ نے یونان کی بھرپور مدد کی۔ 1914 میں جنگِ عظیم شروع ہو گئی جس میں ترکی پھر ایک دفعہ برطانیہ کے حریف ممالک میں شامل

ہوگیا۔ برطانیہ نے عربوں کو بھڑکایا، اور وہ ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان سب واقعات نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ:

(ا) برطانیہ اکثر و بیشتر ان کے مفادات کے خلاف کام کرتا ہے، (ب) برطانیہ کے وفادار رہنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے مسلمانوں کو بھی اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے احتجاج کا طریقہ اپنا لینا چاہیے۔

بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں جب خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں مل کر ایک نہایت قوی لیکن عدم تشدد تحریک کی شکل اختیار کر گئیں، تو کئی قومی ادارے وجود میں آئے۔ ان میں کاشی ودیا پیٹھ بنارس میں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ میں قائم ہوئے۔ یہ ادارے سرکاری اداروں کا بائیکاٹ کرنے لئے قائم کیے گئے تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ جن حالات میں قائم کیا گیا وہ اس قدر سیاسی نوعیت کے تھے کہ ابتدائی برسوں میں اس کا مقصد، خصوصاً اس دور میں جب اس کا خرچہ خلافت کمیٹی اٹھا رہی تھی، تعلیمی سے زیادہ سیاسی لگتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کے تعلیمی مقاصد زیادہ واضح اور قابلِ فہم ہوتے گئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ہر چند کہ مسلمانوں کی قومی بیداری کے جلو میں معرضِ وجود میں آیا تھا، اور اسے ایک نمایاں سیاسی کردار برقرار رکھنا چاہیے تھا، لیکن آخر میں وہ ایک ایسے تعلیمی ادارے کی شکل میں ابھرا جس کا تصور سرسید اور وقار الملک نے کیا تھا۔

سرسید نے اپنے مضمون 'ترقی تعلیمِ مسلمانان' میں ایک ایسے تعلیمی منصوبے کے خط و خال بیان کیے تھے جس میں ایم۔ اے۔ او کالج کی حیثیت مرکزی تھی۔ وہ تین کالجوں کا مجموعہ تھا۔ پہلا کالج وہ تھا جس میں ساری تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ دوسرا وہ جس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہونی تھی۔ تیسرا وہ جس میں عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی جاتی تھی۔

مندرجہ ذیل حوالے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سرسید کے نزدیک ایک درست حکمتِ عملی یہ تھی کہ تعلیم ملک کی اپنی زبان میں دی جانی چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ 'انگلستان کی تہذیبی ترقی کا سبب یہ تھا کہ سارے علوم وفنون اسی ملک کی زبان میں ہیں۔ حالانکہ انگلستان کے بعض حصوں میں انگریزی کچھ ایسے لہجے اور تلفظ سے بولی جاتی ہے کہ اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، پھر بھی مجموعی طور پر انگریزی شمالی مغربی صوبہ اور بہار میں بولی جانے والی اردو کی طرح ہے جسے ہر شخص سمجھتا ہے۔ جو لوگ ہندوستان کو بہتر بنانا چاہتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب سارے علوم وفنون کا ترجمہ اپنی زبان میں کر لیا جائے'[2]۔ مزید یہ کہ ایم اے او کالج[3] کے چار اقسام کے طلبا میں سے سرسید نے ان طلبا کی تعلیم کو بڑی اہمیت دی جو اردو زبان کے کالج میں اس معیار کی تعلیم حاصل کرتے جس معیار کی تعلیم برطانوی کالجوں میں دی جاتی تھی۔ لیکن کالج پر ان لوگوں کا غلبہ تھا جو انگریزی زبان اور سرکاری ملازمتوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی والا حصہ باقی رہا اور اردو والے حصے کو بالآخر تج دینا پڑا۔ ان کے تعلیم کے منصوبے میں انگریزی زبان کا علم حاصل کرنا اس لیے ضروری تھا کہ مغرب کے علوم وفنون کا ترجمہ اردو میں کیا جا سکے۔ اور حقیقتاً سائنٹفک سوسائٹی کا خاص کام بھی یہی تھا۔

مولوی مشتاق حسین (1841 تا 1917) نے، جو اپنے خطاب وقار الملک کے نام سے مشہور ہیں، 1912 میں جامعہ اسلامیہ نام کی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز رکھی تھی۔ ہر چند کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا منصوبہ انھوں نے اس وقت پیش کیا تھا جب گورنمنٹ نے مجوزہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو الحاق کا حق دینے سے انکار کر دیا تھا، ورنہ یہ منصوبہ گورنمنٹ کے انکار سے بہت پہلے ان کے دماغ میں آ چکا تھا[4]۔

انھوں نے لکھا تھا کہ 'اب تک ہم یہ سوچتے رہے تھے کہ علی گڑھ کالج ایک 'کل ہند یونیورسٹی' بن جائے گا، اور ہمیں ہر قسم کی قومی تعلیم کا انتظام کرنے میں مدد کرے گا۔ لیکن اب

ہمیں مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ جامعہ اسلامیہ (قومی دارالعلوم) قائم کرنا چاہیے، اور مسلم یونیورسٹی کے لیے جو رقم جمع کی جا چکی ہے یا کی جا رہی ہے، جامعہ اسلامیہ کو دے دینی چاہیے جو اس رقم کو محفوظ رکھے اور صرف اس کا منافع خرچ کرے۔ صرف وہ رقم علی گڑھ کالج کے پاس رہنے دی جائے جو عمارتوں کے لئے مختص کی جا چکی ہے[5]۔

ان کی رائے تھی کہ جامعہ اسلامیہ میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو، اور انگریزی دوسری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس مجوزہ ادارے پر گورنمنٹ کا کوئی اختیار نہ ہوتا۔

ایک اور جگہ انھوں نے قدرے طنز آمیز لہجے میں لکھا ہے کہ: 'ہمارے ان بچوں کو جو گلوں میں ملازمت (سرکاری) کا طوق نہیں پہننا چاہتے، ریاضی انگریزی میں کیوں پڑھائی جائے؟ کیوں وہ یہ تکلیف اٹھائیں کہ تاریخ انگریزی میں پڑھیں؟ سائنس کے سیدھے سادھے آلات نے تو کبھی یہ نہیں کہا کہ ان کے استعمال کا طریقہ صرف یورپین زبانوں میں سکھایا جائے، وہ تو اس کے لیے تیار رہتے ہیں کہ مسلمان ان کا استعمال اپنی مادری زبان کے ذریعہ سیکھ لیں[6]۔

اس لیے سرسید اور وقار الملک کے خیالات سے یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے ایک ایسے خود کفیل ادارے کا تصور کیا تھا جہاں جدید علوم وفنون بہ زبانِ اردو سکھائے جائیں، اور جو حقیقتاً سرکاری اختیار سے آزاد ہو، اور جس کے طلبا فارغ التحصیل ہو کر ضروری نہیں کہ سرکاری ملازمتوں کی ہی خواہش کریں۔

ان کے خیال میں یہی وہ ادارہ ہو سکتا تھا جو مغربی علوم اور تہذیب کے چیلنج کا بہتر حل ہو۔ یہی ادارہ جدید علوم وفنون کی بہترین چیزیں ہندوستانیوں کو دے سکتا تھا۔ یہی اسلامی علوم اور تہذیب کی نمائندگی کر سکتا تھا۔ چونکہ وقار الملک بانیانِ علی گڑھ کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو کالج کے معاملات میں یورپی اساتذہ کے غیر ضروری اثر کے خلاف تھی، اس لیے ان کے ذہن

میں ضرور ایک ایسا ادارہ رہا ہوگا جو تہذیبی طور سے موجودہ علی گڑھ سے بہت مختلف ہوگا، اس علی گڑھ سے جس پر بلاشبہ مغربی تہذیب طاری ہو چکی تھی۔

اس لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ محض خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کی ہی پیداوار نہیں تھا۔ اس کا خاکہ تعلیم کے اس منصوبے کی تہ میں موجود تھا جو سرسید نے سید محمود کی مدد سے تیار کیا تھا، اور وقار الملک کے اس منصوبے کے مطابق تھا جو انھوں نے اس وقت سوچا تھا جب گورنمنٹ نے علی گڑھ کالج کو الحاقی یونیورسٹی کی حیثیت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

جامعہ وجود میں آیا تو دو ادارے یعنی دیوبند اور علی گڑھ پچاس سال پہلے سے موجود تھے۔ کسی بھی نئے مسلم ادارے نے اپنی تعلیمی حکمتِ عملی ان ہی دونوں اداروں کی مدد سے تیار کی ہوتی۔ یہ دونوں ادارے اب وہ حیثیت اختیار کر چکے تھے کہ تعلیم کے میدان میں مزید ترقی کے لیے ان کو نظر میں رکھنا ضروری تھا۔ جامعہ کی کوشش تھی کہ دونوں کو اپنے دائرۂ تعلیم میں شامل کر لے۔

مولانا محمود حسن نے 29 اکتوبر 1920 کے اپنے افتتاحی خطبے میں کہا تھا: 'اے مادرِ وطن کے فرزندو! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس شدید آزار سے ہمدردی کرنے والے، کہ جو میری ہڈیاں پگھلا رہا ہے، مدرسوں اور خانقاہوں سے زیادہ اسکولوں اور کالجوں میں ملتے ہیں، تو میں نے اور میرے کچھ بے غرض دوستوں نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔ اور اس طرح ہم نے ان دونوں تاریخی مقامات (دیوبند اور علی گڑھ) کو ملا دیا۔'

'کوئی حیرانی کی بات نہیں اگر میرے بعض خیر خواہ میرے اس سفر پر اعتراض کرتے ہیں اور مجھے اس رہ گزر کے مخالف کا نام دیتے ہیں جس پر میرے متوفی بزرگ گامزن تھے۔ لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ میں جتنا علی گڑھ کی طرف بڑھا ہوں، علی گڑھ اس سے زیادہ میری طرف بڑھا ہے'[7]۔

29 اکتوبر 1920 کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاح کے موقع پر خطبۂ صدارت کے لئے دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود حسن کا انتخاب کیا گیا۔ یہ انتخاب خود بانیانِ جامعہ کے طریقۂ فکر پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شیخ الہند محض دارالعلوم دیوبند کے ہی کارکن نہیں تھے، وہ اپنے وقت کی ایک ممتاز مذہبی اور سیاسی شخصیت تھے۔ ان کا انتخاب اور خود ان کے الفاظ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ابتدا میں بانیان نے جس جامعہ کا تصور کیا تھا اسے 'سیکولر' علی گڑھ اور 'دینی' دیوبند کے درمیان ایک کڑی بننا تھا۔ مسلمان مغربی علوم اور تہذیب کے چیلنج کے ابتدائی دنوں ہی سے ایک ایسا ادارہ بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے جس میں جدید علوم اور اسلامی علوم کو طلبا کی ذہنی نشو ونما کے لیے موزوں انداز میں ملایا جاسکے۔ ایسے ہی ادارے کا تصور سرسید اور وقارالملک نے کیا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی مغربی علم اور مشرقی دین کو یک جا کرنے کی ایک ایسی ہی کوشش تھی۔

عزائم اور رجحان

مولانا محمود حسن نے اپنے افتتاحی خطبے میں گاندھی جی کا حوالہ دیا تھا، جنھوں نے سرکاری اداروں کے بارے میں کہا تھا: 'ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم اس پاک صاف دودھ کے مانند ہے جس میں زہر کی تھوڑی سی مقدار بھی ملادی گئی ہو'[8]۔ شیخ الہند نے جامعہ کو بھاپ نکالنے والے اس آلے سے تشبیہ دی تھی جو اس زہر کے ضرر رساں اثرات کو زائل کردے گا۔ انھوں نے گاندھی جی کے مذکورہ بیان کی تشریح ان الفاظ میں کی تھی: 'ایک آزاد یونیورسٹی کی رسمِ افتتاح کا اعلان کیا گیا ہے جو گورنمنٹ کے تعاون اور اس کے اثر سے آزاد ہوگی، اور اس کے سارے کام اسلامی اوصاف اور قومی احساسات کے ساتھ انجام دیے جائیں گے'[9]۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے جلسۂ تقسیمِ اسناد کو خطاب کرتے ہوئے، جو 7 دسمبر 1921 کو علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا، حکیم اجمل خاں نے 'ایسے خاص قسم کے افراد پیدا کرنے پر زور دیا تھا جو

اسلامی تہذیب و ثقافت کو قائم رکھ سکیں'[10]۔ تقسیمِ اسناد کے اسی خطبے میں ایک اور جگہ انھوں نے جامعہ کے نصب العین اور مقاصد کے بارے میں مزید وضاحت کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ جامعہ کا نصب العین ہے: 'ایسے مسلمان بنانا جو نہ صرف اپنے مذہب سے واقف ہوں بلکہ اس پر سختی سے عمل کرتے ہوں، جو اپنے ماضی سے پوری طرح واقف ہوں اور اپنے مستقبل سے باخبر ہوں، جو سمجھتے ہوں کہ دنیا میں ان کی قوم اور ان کے وجود کا کیا مقصد ہے، اور جو اسلامی مبلغین کی صفوں میں کارآمد ارکان کی طرح شامل ہو جائیں۔ انھیں جدید علوم سے یقیناً واقف ہونا چاہیے، لیکن خود انھیں اسلامی طرزِ زندگی کا نمونہ ہونا چاہیے، اور ایک خوددار مسلمان کی زندگی گزارنا چاہیے'۔

مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ ہندوستان کے ہر فرقے کو اپنے ارکان کی تعلیمی ضروریات اس انداز سے پوری کرنی چاہئیں کہ اسے دعوے کے ساتھ قومی تعلیم کہا جا سکے۔ انھوں نے اپنے پُرزور انداز میں 23 جنوری اور یکم فروری 1926 کے کامریڈ کی اشاعتوں میں ایک ایسی تعلیم کی ضرورت کے بارے میں لکھا تھا جو سچے مسلمان پیدا کر سکیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں: 'ہمارے خیال سے مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہوں، اور اس کے لیے نہایت ضروری ہے کہ دنیاوی اور روحانی چیزوں میں جبراً جو امتیاز کیا جاتا ہے کہ ہم اسے ہرگز قبول نہ کریں، اور نہ مختلف اشیا کی طرح مسلمانوں کو عوام الناس اور ملاّ کے خانوں میں بانٹنے کی ہمت افزائی کریں۔ اس ملک میں مسلم معاشرہ جن برائیوں کا شکار رہا ہے ان سے اسے آزاد کرنے کی تدابیر کرنی ہیں، اور ان تدابیر کو تعلیمات کے اپنے منصوبے میں شامل کرنا ہے'[11]۔

اس سے پہلے بھی 1921 کے خطبۂ تقسیمِ اسناد میں حکیم اجمل خاں نے کہا تھا کہ 'چونکہ ہماری تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ملازم اور ماتحت تیار کیے جائیں، بلکہ یہ ہے کہ خود علم میں دلچسپی پیدا ہو، تعلیم چاہتی ہے کہ افراد کے اعمال اچھے ہوں، اس لیے ہم نے خارجی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے غیر فطری طریقے کو یک قلم موقوف کر دیا ہے'[12]۔

حکیم اجمل خاں ایسی تعلیم کے سخت ناقد تھے جس کا مقصد سرکاری ملازمت حاصل کرنا ہو۔ اس لیے انھوں نے اپنے خطبے میں خاصہ وقت کوئی آزاد پیشہ اختیار کرنے اور ایک باعزت زندگی گذارنے کے موضوع پر صرف کیا۔ انھوں نے کہا کہ: 'ایک شخص مسلمان رہ کر اور اسلامی معاشرے کا دیانت دار اور حساس رکن رہ کر بھی اپنی روزی کما سکتا ہے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ روزگار کے لیے مذہب کو قربان کر دیا جائے، اور نہ یہ ضروری ہے کہ ذاتی فوائد کی خاطر قومی مقاصد کو بھینٹ چڑھا دیا جائے..... مجھے بڑی خوشی ہے کہ جامعہ ملیہ نے جو نیا نظامِ تعلیم اپنایا ہے اس میں ہر طالب علم کے لیے حرفہ اور پیشے کی تربیت کو لازمی قرار دیا ہے'[13]۔

مولانا محمد علی نے یہ کہہ کر اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا حق بجانب قرار دیا کہ ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی حکمتِ عملی ان لوگوں کی غلامانہ ذہنیت کی عکاس ہے جو اس پر عمل پیرا ہیں۔ ان کے نزدیک زبان خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے، اور کوئی بھی شخص اپنے خیالات کا اظہار سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ اپنی زبان ہی میں کر سکتا ہے۔ مزید برآں، طالب علم اپنی زبان میں پڑھے گا تو کہیں زیادہ اچھی طرح سمجھ پائے گا۔ چنانچہ ہوا یہ ہے کہ جامعہ میں تکمیلِ تعلیم کی مدت میں دو سال کی تخفیف ہو گئی ہے، اور اس کم مدت میں طالب علم جو علم حاصل کرتا ہے وہ دوسرے اداروں کے طلبا کے علم سے زیادہ ہوتا ہے'[14]۔

انھوں نے بھی اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی وکالت کی۔ چونکہ جامعہ نے کبھی بھی سرکاری ملازمت کے حصول کو اپنا مقصد نہیں گردانا، اسی وجہ سے ذریعۂ تعلیم کے معاملے میں اپنی حکمتِ عملی وضع کرنے میں جامعہ آزاد رہا۔ یہ حکمتِ عملی بہ نسبت اس حکمتِ عملی کے جو سرکاری اسکولوں میں اپنائی جاتی تھی تعلیمی اعتبار سے کہیں زیادہ درست تھی۔

مولانا محمد علی اپنی تعلیمی اسکیم میں دستکاری کی تربیت دینے اور اسے روزگار کا ذریعہ بنانے کو وہی اہمیت دیتے تھے جو دینی تعلیم، اور ذریعۂ تعلیم کے طور پر مادری زبان کو دیتے تھے۔ ان

کا خیال تھا کہ 'حرفوں کی تعلیم' تعلیم یافتہ نوجوان کو محنت کشوں کے وقار اور خود حرفوں کی اہمیت کا احساس کرا سکے گی، اور تعلیم یافتہ طبقوں اور محنت کش طبقوں کے درمیان مراتب کے موجودہ فرق کو دور کر سکے گی'[15]۔

اس بات کی تحریری شہادت موجود ہے کہ مہاتما گاندھی جنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں خاصہ اہم کردار ادا کیا تھا، وہ نہ صرف 'جامعہ ملیہ' کے نام کے ساتھ 'اسلامیہ' لگانے کے حق میں تھے، بلکہ یہ بھی چاہتے تھے کہ جامعہ کا اسلامی کردار بھی باقی رہے[16]۔

حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد فروری 1928 میں ایک میٹنگ ہوئی تھی جس میں موتی لعل نہرو، مولانا محمد علی، پنڈت مدن موہن مالویہ، سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور دیگر ممتاز رہنما شریک ہوئے تھے۔ جامعہ ملیہ کے اغراض و مقاصد پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کہا تھا: 'دینی تعلیم' رواداری، بھائی چارا، اردو کے ذریعے تعلیم اور ہندو مسلم اتحاد جامعہ کی کچھ خصوصیات ہیں'[17]۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے 1933 میں جامعہ کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ: 'جامعہ ایک اسلامی ادارہ ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو تعلیم دینا ہے۔ اس کی تعلیم کی بنیاد دینِ اسلام اور اسلامی ثقافت ہے۔ اسلام کا مفہوم ہے وہ دین جو انسان کو غیر اللہ کی پرستش سے آزاد کردے، جو خدائے واحد کی عبادت کو لازم کرتا ہے اور اس طرح عالمی بھائی چارے کی بنیاد فراہم کر دیتا ہے۔ اسلامی ثقافت کا مطلب وہ روایتیں ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے مثال کے طور پر قائم کی ہیں۔ موجودہ ماحول کے پیشِ نظر جامعہ کے نصب العین کے تحت کچھ اور مقاصد کا اضافہ کرنا ہے۔ وہ یہ ہیں: (ا) آزادی کا عزم۔ محض مادرِ وطن کی تعظیم ہی نہیں بلکہ غیر اللہ کے بجائے اللہ سے محبت، (ب) اردو کی خدمت۔ وہ اردو جسے انصاف پسند لوگ قائم و دائم رکھنا چاہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جامعہ کا بنیادی کام اسلامی تعلیمات، آزادی کا عزم اور اردو

کی خدمت ہے[18]۔

محمد مجیب وہ آخری شیخ الجامعہ تھے جنہوں نے 1928 میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ بیس سال تک زیادہ سے زیادہ 150 روپے مشاہرے پر جامعہ کی خدمت کریں گے۔ وہ اس وقت شیخ الجامعہ تھے جب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے جامعہ کو یونیورسٹی قرار دینے والی (Deemed-to-be-University) حیثیت دی تھی۔ ان کے نزدیک ایک مثالی جامعہ وہ ہوسکتی تھی جو ہندوستانی دستور کے سیکولر کردار سے اس طرح ہم آہنگ ہو کہ اس کے اپنے اسلامی کردار کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ انھوں نے لکھا ہے: 'جامعہ ملیہ ایک اقلیتی ادارہ ہے، ایک ایسی اقلیت کا جس کو یقین ہے کہ اسلام نے ایک اعلیٰ مثالی مدنی زندگی کے فروغ کا کام اس کے سپرد کیا ہے..... میں امید کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ جامعہ ملیہ سرکاری خزانے کے مالکان سے اس بنا پر مطالبات نہیں کرے گا کہ وہ ایک مسلم ادارہ ہے۔ اس کے برخلاف اس کی ضروریات (مجھے پوری امید ہے) بحیثیت ہندوستانی ادارے کے پوری ہوں گی۔۔۔ (مسلم ہونے کے باوجود) ایک حقیقی ہندوستانی ادارے کی حیثیت سے[19]۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد کے بارے میں اس کے بانیوں کے بیانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ جامعہ جن مقاصد کے حصول کے لیے قائم ہوا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ اسلام کی تعلیمات پر عمل دنیاوی اور دینی دونوں طرح کی زندگی کے لیے مفید ہے۔ اس لیے اسلام کا مطالعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم کا لازمی جز ہونا چاہیے۔

2۔ تعلیم کا کام تہذیب کو دوام بخشنا ہے۔ اس کام کو قوت ملتی ہے اگر تعلیم اپنی زبان میں دی جائے۔ ضرورت ہے کہ جامعہ میں ساری تعلیم اردو زبان میں دی جائے۔

3۔ مختلف پیشوں کی بنا پر افراد میں مراتب کے فرق کو دور کرنے کے لیے، محنت کشوں

کے تئیں عزت کے جذبات ابھارنے کے لیے، روزی کمانے کے کسی انداز کی تربیت کرنے کے لیے، طلبا کو دورانِ تعلیم کسی نہ کسی پیشے کی ابتدائی تربیت دی جائے۔

4۔ اسلامی تہذیب کو عالمی تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کے لیے طلبا دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ میل محبت سے رہنا سیکھیں، اور اس طرح اس ملک کے لوگوں سے محبت اور عزت کے رشتے استوار کریں جس ملک میں رہتے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد سے تعلق رکھنے والے مواد کو اگر گہری تنقیدی نظر سے دیکھا جائے تو صاف لگتا ہے کہ دوسرے مذاہب سے عناد اور تعصب کے بغیر اسلامی دائرے میں رہ کر سارے مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ان مقاصد کے پائے استقلال کو ادارے کے نشیب و فراز کے دوران کبھی جنبش نہیں ہوئی۔

تاریخ

ہندوستان کی گورنمنٹ کے اعلامیہ میں ترکی کو امن کی جو شرائط پیش کی گئی تھیں وہ اس قدر سخت تھیں کہ امیر علی نے مئی 1920 کے ٹائمز میں لکھا تھا کہ 'ترکی کو جو شرائط پیش کی گئی ہیں وہ یقیناً کسی سزا سے بھی زیادہ ہیں، وہ ہرگز ایک آزاد ترکی بنانے کی نیت سے نہیں تیار کی گئی ہیں، ایک ایسا آزاد ترکی جس کا وجود ترک نسل کے وطن میں قائم رہ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے بحیثیت آزاد ملک ختم کر دیا گیا ہے، حالانکہ خلافت کو قائم رکھنے کے لئے اس کی آزادی ناگزیر ہے'[20]۔

مولانا محمد علی نے ستیہ گرہ کانوٹس ان الفاظ کے ساتھ دیا تھا: 'اور بلاشبہ وہ ہم ہندوستانی غلاموں سے کہیں گے کہ جاؤ میسوپوٹامیہ میں دوسروں کو بھی غلام بناؤ تاکہ ہندوستان (اور میسوپوٹامیہ دونوں جگہ) ہمارا تسلط قائم رہے۔ لیکن اب ہندوستانیوں کو بھی چیزیں صاف نظر آنے لگی ہیں، اور پہلی اگست کو جب داماد فرید پاشا، وہ برطانوی کارپرداز، عہد نامے پر دستخط کرے چاہے نہ کرے، ہندوستان سرکار برطانیہ سے ہر طرح کا تعاون ختم کر دینے کے عزم کا اعلان

کردے گا۔[21]

12 اکتوبر 1920 کو مہاتما گاندھی اور علی برادران اس ارادے سے علی گڑھ آئے کہ عدم تعاون کی تحریک میں شریک کرنے کے لیے طلبا کو گورنمنٹ کے اداروں سے اور گورنمنٹ کی مالی امداد سے چلنے والے اداروں سے دور رکھا جائے۔ اس سلسلے میں ایم اے او کالج کے ٹرسٹیوں کے سکریٹری اور پرنسپل کو الٹی میٹم دے دیا گیا۔ الٹی میٹم پر ان حضرات نے دستخط کیے: (1) ایچ ایم اجمل خاں، (2) ایم اے انصاری، (3) معظم علی خاں، (4) ظہور احمد، (5) شوکت علی، (6) محمد علی، (7) این اسماعیل خاں، (8) ایچ ایم موسیٰ خاں، (9) اے مصطفےٰ خاں۔

اس درمیان میں پرنسپل ضیاالدین نے طلبا کے والدین اور سرپرستوں کو کالج کی نازک صورتِ حال سے مطلع کر دیا، اور لکھا کہ اپنے بیٹوں اور زیرِ سرپرستی طلبا کو واپس بلا لیں۔ 27 اکتوبر 1920 کو بورڈ آف ٹرسٹیز کی ایک میٹنگ اس سوال پر غور کرنے کے لیے بلائی گئی کہ کیا گورنمنٹ سے مالی امداد لینا بند کر دی جائے اور گورنمنٹ سے ہر طرح کا تعلق ختم کر دیا جائے۔ 124 میں سے کُل 62 ٹرسٹیوں نے میٹنگ میں شرکت کی۔ 11 ٹرسٹی گورنمنٹ سے عدم تعاون کے حق میں تھے اور باقی اس کے مخالف تھے۔

29 اکتوبر 1920 کو جامعہ ملیہ اسلامیہ یا نیشنل مسلم یونیورسٹی کی رسمِ افتتاح کا اہتمام ایم، اے، او، کالج کی مسجد میں کیا گیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے خطبہ افتتاح لکھا اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی، خواجہ عبدالمجید اور دیگر ممتاز حضرات نے افتتاحی تقریب میں شرکت کی۔

کالج میں یہ خبر گرم تھی کہ نیشنل مسلم یونیورسٹی کی پڑھائی کالج کے کمروں میں ہوگی۔ 31 اکتوبر 1920 کو ذمہ دارانِ کالج کے کہنے پر ضلع مجسٹریٹ کیمپ بیل نے عدم تعاون کرنے والوں سے عمارتیں خالی کرنے کا نوٹس مولانا محمد علی کو دیا۔ وہ دیگر رفقا کے ساتھ اولڈ بوائز لاج میں

ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے نوٹس کی تعمیل کی، اور پُرامن انداز سے ایم اے او کالج کی عمارتوں سے باہر نکل آئے۔ یہ کارواں بسوں، لاریوں اور پیدل لوگوں کی شکل میں ہرے جھنڈے لیے، اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا رواں ہوا۔ انھوں نے منٹو سرکل (یونیورسٹی اسکول) کے سامنے سڑک کے دوسرے جانب اپنے خیمے نصب کر لیے جامعہ کی پہلی عمارتیں علی گڑھ میں لال ڈگی کے نزدیک پھوس کی چھتوں والے بنگلے تھے [22]۔

22 نومبر 1920 کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مجلس تاسیس (فاؤنڈیشن کمیٹی) بنائی گئی۔ حالانکہ مرکزی خلافت کمیٹی نے اسی سال یہ قرارداد منظور کی تھی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک خودمختار اور آزاد ادارہ ہے، اور سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں، لیکن اس کے طلبا اور اساتذہ تحریکِ خلافت کے سرگرم حامی رہے۔ 1922 میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو جب حقیقی معنی میں ایک آزاد جامعہ کی ضرورت محسوس ہونے لگی تو انھوں نے ادارے کے ہمدردوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ادارے کے لیے ایک بڑی رقم جمع کریں۔

حالانکہ مرکزی خلافت کمیٹی نے 1923 سے ہی جامعہ کو مالی امداد دینی بند کر دی تھی، لیکن 1925 تک جب تک جامعہ قرول باغ دلی میں منتقل نہ ہوئی خلافت کمیٹی کا اثر جامعہ کے انتظامی معاملات پر برقرار رہا۔ اس دوران میں مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں ترکی نے اپنے کھوئے ہوئے یورپی علاقے دوبارہ حاصل کر لیے، سلطنت اور خلافت کو ختم کر دیا گیا، اور ترکی کو ایک سیکولر یورپی ریاست بنانے کا عمل شروع ہو گیا۔ ان اقدامات سے ہندوستان میں تحریکِ خلافت کا کوئی جواز باقی نہ رہا۔ خلافت میں دلچسپی کم ہوئی تو ادارے میں بھی کم ہونے لگی، یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب بورڈ آف ٹرسٹیز کے بیشتر ارکان نے یہ مشورہ دیا کہ جامعہ کو بند کر دیا جائے۔ اس مرحلے پر حکیم اجمل خاں نے، جن کی حوصلہ افزائی اور بہت سے کارکنان کر رہے تھے، جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا۔

جولائی 1925 سے جب جامعہ دہلی منتقل ہوئی اپنی وفات دسمبر 1927 تک، حکیم اجمل خاں ہی جامعہ کے روحِ رواں تھے۔ اس کی مالی حالت نہایت غیر اطمینان بخش تھی۔ نہ اس کی کوئی مستقل آمدنی تھی، نہ اس کا تعلق فیاض اور دریا دل عطیہ کنندگان سے مستقل طور پر ہو پایا تھا۔

حکیم اجمل خاں نے کسی نہ کسی طرح ایسے ذرائع سے جن کا علم جامعہ کے ارکان کو بھی نہ تھا ادارے کو چلانے کے لئے کافی رقم کا انتظام کر لیا تھا۔ فروری 1926 میں ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے دو ساتھیوں، ڈاکٹر عابد حسین اور محمد مجیب، کے ہمراہ یورپ سے واپس آئے اور جامعہ کے کاموں میں شریک ہو گئے۔ جامعہ کی نشو ونما میں ان تینوں کو اہم رول ادا کرنا تھا۔

محمد مجیب نے ان دنوں کی جامعہ کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے: 'ان دنوں جامعہ کسی کھلی جگہ میں نہیں تھی۔ سڑک کے ایک طرف لطیف منزل نام کی ایک لمبی عمارت کی پہلی منزل میں اس کی اقامت گاہیں، کارکنوں کی رہائشیں، عبادت گاہ اور کھانے کا بڑا کمرہ تھے۔ سڑک کے دوسری طرف چار مکانات تھے جن میں سے دو کمرۂ جماعت تھے، ایک میں کتب خانہ تھا، ایک میں دفتر تھا، اور بس یہی پوری جامعہ تھی[23]۔ حکیم اجمل خاں کی زندگی ہی میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) اور ڈاکٹر عابد حسین نے مسجل (رجسٹرار) کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ ڈاکٹر عابد حسین رسالہ 'جامعہ' کے مدیر بھی ہو گئے تھے۔، جو پہلی دفعہ جنوری 1923 میں شائع ہوا تھا، اور اس وقت تک جامعہ کے جریدے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

حکیم اجمل خاں کی وفات نے جامعہ کی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ دہلی کے شہریوں نے جو حکیم اجمل خاں کی عزت کے ساتھ ان سے محبت بھی کرتے تھے، ان کے بڑھاپے کی اولاد[24] کی پرورش کی خاطر فروری 1928 میں ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا۔ اس جلسے میں اس زمانے کے بہت سے سربرآوردہ قائدین نے شرکت کی جن میں موتی لعل نہرو، جواہر لعل نہرو،

پنڈت مدن موہن مالویہ، سروجنی نائیڈو، سردار سردل سنگھ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی شامل تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے 'اجمل جامعہ فنڈ' قائم کرنے کی تجویز پیش کی جس میں جامعہ کی عمارتیں تعمیر کرنے کے لئے آٹھ لاکھ روپے کا ہدف رکھا۔ اس اجلاس کے مختلف شرکاء نے کل چودہ ہزار روپے دینے کا اعلان کیا۔ یہ رقم اتنی کم تھی کہ پورا ہدف حاصل کرنے کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔

جامعہ کے صاحب اختیار لوگوں کی فوری ضرورت آٹھ لاکھ روپے کا ہدف حاصل کرنا نہیں تھی بلکہ پچپن ہزار کی وہ رقم حاصل کرنا تھی جو سابقہ قرضوں کی ادائیگی اور نئے تعلیمی سال کے اخراجات کے لئے درکار تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے امناء جامعہ (جامعہ کے ٹرسٹیز) کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ذریعے ایک طویل خط میں لکھا کہ یا تو مطلوبہ رقم بڑھائیں اور جامعہ کو چلائیں، یا اسے کارکنانِ جامعہ کے حوالے کردیں جو ذاتی قربانیاں دے کر دل و جان سے اس کی خدمت کے لئے تیار ہیں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے خط کے جواب میں بیشتر امناء (ٹرسٹیز) نے جامعہ کو چلانے میں اپنی معذوری کا اظہار کیا، اور ایک اجلاس میں طے کیا کہ جامعہ کو اس کے کارکنان کے حوالے کردیا جائے۔

جامعہ کے کارکنوں نے انجمن تعلیم ملی (کانفرنس فار نیشنل ایجوکیشن) نام کی ایک انجمن بنائی اور بیس سال تک زیادہ سے زیادہ ایک سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر جامعہ کی خدمت کرنے کا عہد کیا۔ جن پہلے گیارہ کارکنوں نے یہ عہد کیا ان کے نام ہیں: (1) ڈاکٹر ذاکر حسین، (2) محمد مجیب، (3) مولانا اسلم جیراجپوری، (4) مولانا خواجہ عبدالحی، (5) حافظ فیاض احمد، (6) ارشاد الحق، (7) برکت علی، (8) سعد الدین، (9) سعید انصاری، (10) شفیق الرحمٰن قدوائی، (11) حامد علی خاں[25]۔ آنے والے برسوں میں کچھ اور کارکنوں نے بھی یہی عہد کیا۔

انجمن تعلیم ملی ملک میں، خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے، آزادی کے حصول سے

پہلے کوئی سرکاری امداد نہ لینے، اور دنیا کے سارے مذاہب کے تئیں رواداری کا رویہ رکھنے کے اصولوں پر قائم رہی[26]۔ انجمن کے پہلے عہدیدار ڈاکٹر مختار احمد انصاری، صدر (پریسیڈینٹ)، ڈاکٹر ذاکر حسین، معتمد (سکریٹری)، سیٹھ جمنا لال بجاج، خازن (ٹریژرر) تھے اور مولانا اسلم جیراجپوری، خواجہ عبدالحئی، محمد مجیب اور شفیق الرحمٰن قدوائی اراکینِ مجلسِ منتظمہ (ممبران ایگزیکیوٹیو کاؤنسل) تھے۔ اگرچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں، جن میں اسکول اور کالج دونوں کی سرگرمیاں شامل تھیں، علی گڑھ ہی میں شروع کر دی تھیں، لیکن اس نے کسی خاص سطح یعنی اسکول یا کالج کی تعلیم کا معیار اوپر اٹھانے پر کوئی خاص زور نہیں دیا تھا۔ لیکن اب ذاکر حسین نے اپنے ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ اپنی ساری توجہ ابتدائی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ جامعہ کے کارکن گاندھی جی کی شروع کردہ شہری نافرمانی کی تحریک کے سال میں بھی نہایت احتیاط اور اخلاص کے ساتھ تعلیم کے کام میں ہی مصروف رہے۔ جن لوگوں نے تحریک میں حصہ لیا انھوں نے بڑی سمجھ داری کا ثبوت دیا اور ادارے سے کنارہ کش ہو گئے۔ وہ صرف ذاتی حیثیت سے تحریک میں شامل رہے۔ تحریک کی وجہ سے جو لوگ جیل گئے ان میں حافظ فیاض احمد، دیوداس گاندھی[27]، شفیق الرحمٰن قدوائی، اور طلبا میں حسین حسنان، کنک چندر ڈیکا اور کرشنا نائر شامل تھے[28]۔

1929 میں قرول باغ میں جامعہ کی پہلی عمارت بننا شروع ہوئی۔ اسکول کے قریب ایک بیگھہ زمین باغبانی کے لیے خرید لی گئی۔ جیسے پہلے لکھا جا چکا ہے نئے تعلیمی سال کے آغاز سے ہی ابتدائی سطح کی تعلیم کو بہتر بنانے پر توجہ مرکوز کر دی گئی تھی۔ نئے تجربے کیے گئے۔ بچوں کا بینک اور بچوں کی دوکان کے منصوبے اس مقصد سے شروع کیے گئے کہ بچوں کو اسکول کے اندر رہ کر حقیقی زندگی کے تجربے ہو جائیں۔

ان دنوں کے قرول باغ میں آج کی طرح کی بھیڑ بھاڑ تو تھی نہیں، پھر بھی وہ ایسی جگہ نہ تھی جہاں ایک ترقی پذیر ادارہ پھل پھول سکتا۔ اس لیے جامعہ کے ذمہ داران ایک ایسی جگہ کی

تلاش میں تھے جو ایک بڑھتے ہوئے ادارے کے لئے موزوں ہو۔ اوکھلا گاؤں، جو ریلوے اسٹیشن سے تقریباً دس میل دور تھا، جس کے ایک طرف اراولی پہاڑی سلسلے کا قدرے نیچا پتھریلا علاقہ تھا اور دوسری طرف دریائے جمنا تھا، قدرت کی گود میں بچوں کے ذہنوں اور جسموں کی بالیدگی کے لیے ایک مثالی جگہ لگا۔ یہاں 1931 میں اس رقم سے زمین خرید لی گئی جو ریاستِ حیدرآباد نے عمارتوں کی تعمیر کے لیے دی تھی۔ پہلی مارچ 1935 کو مدرسے کے سب سے کم عمر طالب عبدالعزیز نے مدرسہ ابتدائی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ترکی کی مشہور مصنفہ خالدہ ادیب خانم جنھوں نے جامعہ میں ایک عصری موضوع پر سلسلہ وار کئی تقریریں کی تھیں، اس موقع پر موجود تھیں۔

جامعہ کی عمارات کے ماہر تعمیرات اور نقشہ نویس چیکوسلواکیہ نژاد کارل ہائنز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بڑے آزاد طبیعت آدمی تھے جو عبدالکریم نام کے ایک ترک شہزادے کے ساتھ حیدرآباد آ گئے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور کارل ہائنز دونوں جرمن زبان جانتے تھے، اس لیے جلد ہی دوست بن گئے۔ ہائنز نے بلا اجرت جامعہ کی عمارتیں بنوانے کی پیش کش کر دی۔ کارل ہائنز کے عمارتی نقشوں کو جنھوں نے حقیقی شکل دی وہ خاص معمار عبداللہ مستری تھے۔

انجینیر خواجہ لطیف حسن پانی پتی نے وقتاً فوقتاً تعمیراتی کام کی نگرانی کرنے کی پیش کش کی۔ جو پہلی عمارت قابلِ استعمال ہوئی وہ مدرسہ ابتدائی کہلائی حالانکہ اس کو نقشے کے مطابق اقامت گاہ ہونا تھا۔ یہ عمارت ابھی نامکمل تھی۔ اگست 1936 میں اسی نامکمل عمارت میں مدرسہ ابتدائی کے اقامتی بچوں کو منتقل کر دیا گیا۔ مدرسہ ابتدائی میں جو بچے اپنے گھروں سے پڑھنے آتے تھے وہ حسبِ سابق قرول باغ ہی میں پڑھتے رہے۔ اس دوران جامعہ کے دوسرے ادارے قرول باغ ہی میں رہے، اور جامعہ نگر یعنی اوکھلا منتقل ہونے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔

گو استادوں کے مدرسے (ٹیچرس کالج) کی رسمِ افتتاح قرول باغ میں 4 اگست 1938 کو ہوئی تھی، لیکن اس کا سنگِ بنیاد جناب کے سنتانم نے 7 مئی 1939 کو جامعہ نگر میں

رکھا۔اس سے پہلے پہلی مارچ 1939 کو انجمن طلبائے قدیم (اولڈ بوائز ایسوسی ایشن) کی عمارت کا سنگِ بنیاد بھی جامعہ نگر میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے رکھا تھا، جو خود بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قدیم طلبا میں تھے[29]۔

1938-39 کا تعلیمی سال سرگرمیوں سے پُر تھا۔ مدرسہ ثانوی کی عمارت کی تعمیر اس وجہ سے فوراً شروع ہوگئی کیونکہ ریاست حیدرآباد نے ایک لاکھ روپے عطیہ کر دیے تھے۔ یاد رہے کہ مدرسہ ابتدائی کی تعمیر بھی ریاست حیدرآباد کے عطیے سے ہوئی تھی۔ اس تعلیمی سال کی ایک خاص بات یہ تھی کہ شفیق الرحمٰن قدوائی نے ایک نیا شعبہ قائم کیا۔ یہ شعبۂ تعلیم و ترقی تھا جو ابتدا میں مدرسۂ شبینہ (رات کا اسکول) کے نام سے شروع ہوا تھا، اور اس کا مقصد ان بالغوں کو تعلیم دینا تھا جن کو زندگی میں اسکول جانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ تعلیم و ترقی کا مقصد بھی یہی تھا، لیکن اب اس کی سرگرمیوں کا دائرہ زیادہ وسیع اور زیادہ نمایاں ہوگیا تھا۔

اس تعلیمی سال میں ایک اور اہم واقعہ یہ ہوا کہ 4 جون 1939 کو سوسائٹی کا نام بدل کر اسے انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے رجسٹر کرایا گیا۔ اب تک سوسائٹی کا نام انجمن تعلیم ملی تھا۔ لیکن 8 دسمبر 1938 کے جلسے میں یہ طے کیا گیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو انجمن تعلیم ملی کے کاموں میں سے ایک کام تصور کرنے کے بجائے خود ایک مکمل کام سمجھا جائے۔ چنانچہ انجمن تعلیم ملی کا نام بدل کر انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھ دیا گیا۔ اس تبدیلی کو نظر میں رکھ کر انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کا دستور 8 دسمبر 1938 کو منظور کیا گیا۔ دستور کے کچھ اہم اصول و مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

2 (ا) ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو دینی اور سیکولر تعلیم فراہم کرنا اور اسے فروغ دینا، ایسی تعلیم جو تعلیم کے درست اصولوں کے مطابق ہو اور قومی اور جماعتی زندگی کے موافق ہو، اور اسی طور طریقے کے ادارے قائم کرنا اور انھیں جاری رکھنا۔

3(ا) یہ ایک خودمختار تعلیمی تنظیم ہوگی جو حکومت یا کسی خارجی تنظیم کو اپنانے، دستور بنانے یا اس میں ترامیم کرنے، اصول اور ضوابط بنانے، نصابات تیار کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔

3(ب) یہ کوئی امداد ایسی شرائط پر قبول نہیں کرے گی جو اس کے مقاصد اور اصولوں کے منافی ہوں۔

3(ج) اس کے تحت چلنے والے سارے اداروں میں ہر سطح کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جائے گی، البتہ مخصوص صورتوں میں دوسری زبانوں کو بھی ذریعۂ تعلیم بنایا جاسکتا ہے۔

3(د) یہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان باہمی اتفاق اور باہمی قدر و منزلت کو فروغ دے گی[30]۔

دوسرے تعلیمی سال یعنی 40-1939 کے شروع میں استادوں کا مدرسہ (ٹیچرس کالج) اس نامکمل عمارت میں منتقل ہوگیا جس میں شروع میں آس بیسٹس کی چھتوں کے صرف چھ ہال تھے۔ اس کالج نے بنیادی تعلیم کے ابتدائی اسکولوں کے لئے اساتذہ تیار کرنے کی شروعات کی۔ ان کا یہ کورس جلد ہی مقبول ہوگیا۔ کامیابی کے ساتھ کورس پورا کرنے پر طلبا کو جو ڈپلوما دیا جاتا تھا اسے حکومت نے 1945 میں مان لیا۔ سرجان سارجینٹ، جو ہندوستانی گورنمنٹ کے کمشنر تعلیم تھے، انھوں نے جامعہ کے کورسوں کو جانچنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے صرف میٹرک کے سرٹیفکٹ اور ڈپلوما ہی کو تسلیم کیا تھا[31]۔

مطالعات کے لیے کورسز

مولانا محمد علی نے، علی گڑھ میں نئی قائم شدہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب اور کورس مرتب کرنے کے رہنما اصولوں پر تفصیلی انداز میں اپنے مضمون بعنوان 'نیشنل مسلم یونیورسٹی' میں لکھا

تھا کہ سب سے پہلا اصول ہے کہ مذہب کا مطالعہ اس انداز سے کرایا جائے کہ وہ آسانی سے طلبا کے ذہن نشین ہو جائے۔ اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ قرآن کے معنی عربی زبان جان کر ہی زیادہ اچھی طرح سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس لیے قرآن اور حدیث پڑھانے کے لیے تو پڑھائے ہی جائیں، لیکن عربی زبان سکھانے کے لیے پڑھائے جائیں۔ عربی زبان کے علم میں عربی نظم ونثر کے مطالعے سے تو بہر حال اضافہ ہوگا[32]۔

ان کے نزدیک مندرجہ بالا اصول کا دائرہ اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ طالب علم میں یہ لیاقت پیدا ہو جائے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے کسی بھی اعلیٰ ادارے میں داخلہ لے سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ جامعہ کا نوجوان مسلم طالب علم پہلے ہی اس سطح کے سیکولر علوم پڑھ لیتا ہے جو دوسرے کالجوں میں انٹرمیڈیٹ کی سطح تک پڑھائے جاتے ہیں۔ جامعہ کے کورس کے تحت وہ تفسیر، حدیث اور فقہ اور ان سب علوم کے اصول، عقائد، کلام اور سیرت نیز تاریخ اسلام بمعہ جغرافیہ کی مطلوبہ معلومات کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس کورس کی تکمیل کے بعد وہ بیس برس یا اس سے کم وبیش عمر میں مذہبی استاد یا مولوی کے منصب کا حقدار ہو سکتا ہے، اور ساتھ ساتھ وہ اس قدر مہذب بھی ہو سکتا ہے جتنا مہذب کسی بھی یورپین یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوتا ہے[33]۔

دوسرا اصول ذریعہ تعلیم سے متعلق تھا۔ ان کے بقول 'یہ غیر معقول اور غلامانہ ذہنیت کی بات ہے کہ علم کی مختلف شاخوں کی تعلیمات ایک خارجی زبان کے سرکش ذریعے سے برآمد کی جائیں[34]۔ اس ضمن میں ان کی تجویز یہ تھی کہ دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جائے۔

ان کا تیسرا اصول زبانوں کے مطالعے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسکول کے طلبا کے لیے انھوں نے جو فارمولا تجویز کیا تھا اس میں اپنی مادری زبان کوئی دوسری دیسی زبان، اور کوئی غیر ملکی زبان بشمول انگریزی، جرمن اور فرنچ شامل تھیں۔ لیکن ان کی تجویز یہ تھی کہ ابتدائی کی سطح سے

انگریزی کو بالکل خارج کر دیا جائے۔ غالباً اسلام سے قریبی تعلق کی بنا پر طالب علم کو عربی اور فارسی پڑھانے کی وکالت کی تھی۔ اس طرح اسکول کی تعلیم کے دوران مختلف معیار تک پڑھائی جانے والی زبانوں کی تعداد بڑھا دی تھی۔

ان اصولوں پر بحث کرنے کے بعد مولانا محمد علی نے ان مضامین کے نام لکھے جو تعلیم کے مختلف سطحوں پر یعنی ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی میں پڑھائے جا سکتے تھے۔

تعلیمی اور سماجی اہمیت کا ایک اور اصول ہاتھ کے کام اور کسی موزوں ہنر کی تربیت سے متعلق تھا۔ ان کے رائے میں ہاتھ کے کام اور ہنر کی تربیت کو لازمی بنا کر طلبا کو اس احساسِ غلامی سے آزاد کرایا جا سکتا تھا جو گورنمنٹ کے (سرکاری ملازمت کے حصول کی خاطر) ان میں پیدا ہو گیا تھا، اور اس دوری کو بھی ختم کیا جا سکتا تھا جو آج کے تعلیم یافتہ طبقوں اور روزگار کے لیے حرفوں پر انحصار کرنے والے عوام الناس کے درمیان پیدا ہو گیا تھا[35]۔

اپنے مضمون کے آخری چند صفحات میں انھوں نے تسلیم کیا تھا کہ جامعہ تعلیم کے اس منصوبے پر عمل پیرا تھا جس کا خاکہ انھوں نے پیش کیا تھا۔ ان کے نزدیک منصوبے کو پورے طور سے نہ اپنانے کا سبب سرمایے کی کمی تھی۔ سرمایے کے فراہمی کے لیے انھوں نے لوگوں سے اپیل کی تھی۔

جامعہ نے 1923 میں طلبا کو جو کورس پیش کیے اور جو مضامین پڑھائے گئے وہ 1923-24 کے تعلیمی سال کے دستور العمل میں دیے ہوئے ہیں۔ ان دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ ہی میں تھی۔ اس دستور العمل میں بھی تقریباً وہی اصول دیے گئے ہیں جو مولانا محمد علی نے بیان کیے ہیں۔ دستور العمل کے مطابق تعلیم کی چار منزلیں تھیں یعنی مکتب، ابتدائی، ثانوی، اور یونیورسٹی۔

مکتب کے کورس میں حروفِ تہجی کا پڑھنا اور لکھنا، گنتی، مذہب اور اخلاقیات کی زبانی

تعلیم شامل تھے۔اس کورس کی مدت ایک سال تھی،اور اسے گھر رہ کر یا کسی قومی مدرسے میں مکمل کیا جاسکتا تھا۔

ابتدائی تعلیم کی مدت پانچ سال تھی۔اور بچے کو دینیات، ریاضی اور تحریر کی نقل کرنا، نیز سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور ملک کے دستور پڑھائے جاتے تھے۔

ثانوی تعلیم کی مدت بھی پانچ سال تھی، اور طلبا کو مندرجہ ذیل مضامین پڑھائے جاتے تھے:

I لازمی مضامین

(1) دینیات

(2) عربی

(3) اردو اور ہندی

(4) انگریزی

(5) ریاضی

(6) حرفہ

II اختیاری مضامین

(1) تاریخ ہندوستان اور مبادی جغرافیۂ عالم (آخری دو سالوں میں مبادی علمِ سیاست)

(2) ڈرائنگ

(3) سائنس

دینیات اور عربی کی جگہ ہندو طلبا ہندو اخلاقیات اور سنسکرت لے سکتے تھے۔

پیشوں کی تعلیم: کپڑے بننا، برقی ملمع سازی (الیکٹرو پلیٹنگ)، رنگ سازی

(پالشنگ)، جلد سازی، طباعت (لتھوگرافی یا پتھر کی چھپائی اور ہر طرح کا ٹائپ یعنی چھپائی کے لیے ڈھالے ہوئے ہر طرح کے حروف سے چھپائی جو دونوں طرح کی ہو، ایک ہاف ٹون یعنی فوٹو بلاک کی چھپائی جس میں کالے اور سفید کے درمیانی رنگوں کے مختلف مدارج موٹی یا مہین بندکیوں کے تدریجی فرق سے ظاہر ہوتے ہیں، اور دوسری لائن بلاک میکنگ یعنی خاکہ یا محیط خصوصاً کسی نقشے یا ڈیزائن کام، کاپی رائٹنگ یعنی اشاعت کے لئے متن تیار کرنا، شارٹ ہینڈ یعنی مختصر نویسی، اور ٹائپ رائٹنگ۔ مندرجہ بالا تمام پیشوں کی تعلیم کے لیے کورس تیار کیے گئے تھے۔

یونیورسٹی کی سطح کے طلبا کے لیے دو کورس تھے: (1) آنرز ڈگری کورس، اور (2) عام ڈگری کورس۔ ہر کورس کی مدتِ تکمیل تین سال تھی بشرطیکہ طالب علم نے پری لمنری یا ایک خاص امتحان پاس کرلیا ہو، ورنہ میٹرک امتحان کے بعد ہر کورس کی مدتِ تکمیل چار سال تھی۔

جو طلبا جامعہ کے علاوہ کسی دوسری یونیورسٹی سے میٹرک امتحان پاس کرتے یا کسی بورڈ آف ایجوکیشن سے میٹرک کرتے انھیں ایک سالہ کورس کرنا ہوتا جسے پری لمنری کلاس یا یونیورسٹی میں داخلے کا ابتدائی کلاس کہا جاتا تھا۔

پری لمنری کلاس کے مضامین مندرجہ ذیل تھے:

I لازمی مضامین:

(1) دینیات

(2) عربی

(3) اردو اور ہندی

(4) انگریزی

II اختیاری مضامین:

مبادیٔ معاشیات اور علمِ شہریت

یا

مبادیٔ طبیعیات اور علمِ کیمیا

جامعہ کے ثانوی کورس کی طرح ہندو طلبا دینیات اور عربی کی جگہ ہندو اخلاقیات اور سنسکرت لے سکتے تھے۔

پری لمنری کلاس پاس کرنے کے بعد طالب علم بی اے (آنرز) یا بی اے میں داخلہ لے سکتا تھا۔ بی اے (آنرز) بڑا پُر وقار کورس سمجھا جاتا تھا۔ اس کورس میں دینیات لازمی تھی اور طالب علم مندرجہ ذیل میں کسی ایک اسکول[36] کو عمیق مطالعے کے لیے انتخاب کر سکتا تھا:

(1) اسلامی مطالعات

(2) عربی زبان وادب

(3) فارسی زبان وادب

(4) انگریزی زبان وادب

(5) فلسفہ

(6) عمرانیات

(7) کیمیا

(8) طبیعیات

(9) تاریخ

(10) قانون

چونکہ سارے اسکولوں میں تعلیم کے لیے یا تو کوئی انتظام ہی نہیں تھا اور اگر تھا تو نام کا ہی تھا اس لیے جامعہ نے 24-1923 کے تعلیمی سال میں پہلے تین اسکولوں میں داخلے کی اجازت دی تھی۔ 25-1924 کے تعلیمی سال کے دستور العمل میں یہ امید دلائی گئی تھی کہ تعلیمی سال کی

دوسری معیاد میں طبیعیات، کیمیا اور قانون کی تدریس کے لیے انتظامات کیے جائیں گے۔

پری لمنری کورس پاس کرنے کے بعد دوسرا متبادل بی اے میں داخلہ لینا تھا۔ اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل تھے:

I لازمی مضامین

(1) دینیات

(2) انگریزی کمپوزیشن نیز زبان کی عام معلومات

II اختیاری مضامین

مضامین کے مندرجہ ذیل مجموعوں میں سے کسی ایک مجموعے سے دو مضامین:

(ا)

(1)	عربی	(2)	فارسی
(3)	اردو	(3)	سنسکرت
(5)	معاشیات	(6)	تاریخ
(7)	شہریت اور سیاسیات	(8)	ریاضی
(9)	فلسفہ	(10)	قانون
(11)	جغرافیہ		

(ب)

(1)	طبیعیات	(2)	کیمیا
(3)	حیوانیات	(4)	نباتات
(5)	ارضیات (جیولوجی)	(6)	ریاضی

تدریس اور صحافت میں بھی ڈپلوما دینے کی تیاریاں کی گئی تھیں جن میں ہر کورس ایک

سال کا تھا، کامرس کا کورس دو سال کا تھا۔ ڈپلوما کورسوں میں داخلے کے لیے کم سے کم بی اے ہونا ضروری تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر ڈپلوما میں ایک کامیاب طالب علم کو معاوضے کے ساتھ شعبۂ تعلیم میں جگہ دینے کی بھی پیش کش کی گئی تھی بشرطیکہ اس نے اپنے ڈپلوما کورس کو امتیاز کے ساتھ پاس کیا ہو۔

اس کے علاوہ جامعہ نے پیشہ ورانہ تربیت کے واسطے دو سال کی مدت والے سرٹیفکٹ کورس بھی پیش کیے تھے۔ ایک طالب علم کو دو سال میں جامعہ کے پیش کردہ کورسوں میں سے دو پیشہ ورانہ کورس پورے کرنے ہوتے تھے۔ مزید برآں، دینیات، بنیادی بک کیپنگ یعنی تجارتی سودوں کی بنیادی حساب نویسی، اردو اور انگریزی پڑھنا ہوتی تب جا کر وہ سرٹیفکٹ حاصل کرنے کا حقدار ہو پاتا[37]۔

جامعہ ماہرین کی غیر موجودگی اور مادی سہولتیں نہ ہونے کے سبب 24-1923 کے دستور العمل میں دیے جانے والے متعدد کورسوں کا انتظام نہ کر سکا تھا۔ یہ بات 25-1924 کے دستور العمل سے واضح ہو جاتی ہے۔

1946 میں جب جامعہ نے اپنی سلور جوبلی منائی تو وہ خاصہ جم چکا تھا، اور اس کے اثاثوں کی قیمت کوئی تیس سے پینتیس لاکھ روپے تک تھی[38]۔ اس کے پیش کردہ کورس بھی لگے بندھے معمول کی طرح چلنے لگے تھے۔ 1944 میں جب جامعہ کے میٹرک سرٹیفکٹ اور ڈپلوما ان ٹیچنگ کو مان لیا گیا تو اس کے ابتدائی اور ثانوی اسکول نیز استادوں کا مدرسہ یعنی ٹیچرس کالج تعلیمی اعتبار سے معتبر سمجھے جانے لگے۔

1946 میں ابتدائی اسکول کے کورس میں (1) اسلامیات، (2) اردو، (3) ریاضی، (4) معلومات عامہ، (5) انگریزی، (6) آرٹ اور کرافٹ یعنی حرفہ شامل تھے۔ ابتدائی کا یہ کورس 1923 کی پانچ سالہ مدت سے بڑھ کر چھ سال کا ہو گیا تھا۔

ثانوی اسکول کا کورس 1923 کے پانچ سالہ کورس کی جگہ اب چار سال کا ہو گیا تھا۔ اس میں پڑھائے جانے والے مضامین کی تعداد اب چھ کے بجائے سات ہو گئی تھی۔ وہ مضامین یہ تھے : (1) اسلامیات، (2) اردو، (3) ریاضی، (4) تاریخ اور جغرافیہ، (5) انگریزی، (6) جلد سازی اور لکڑی کا کام، (7) ڈرائنگ یا سائنس۔

1946 میں جامعہ کالج نے پری لمنری کلاس ختم کر دیا تھا۔ کالج نے اب جامعہ سینیئر اور سندی جامعہ کورس شروع کر دیے تھے۔ جامعہ سینیئر یعنی دوسالہ انٹرمیڈیٹ کورس مکمل کرنے کے بعد طالب علم سندی جامعہ یعنی بی اے میں داخلہ لے سکتا تھا۔ یہ بھی دو سال کا کورس تھا۔ سندی جامعہ کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ مستقبل میں استاد یا صحافی بننے کے لیے یہ کورس انتہائی کارآمد تھا۔

جامعہ سینیئر اور جامعہ سندی دونوں کورسوں میں ذیل کے مضامین شامل تھے:

(1) اسلامیات، (2) اردو، (3) انگریزی، (4) تاریخ اور سیاسیات، (5) معاشیات۔

اسلامیات کے کورس کا تعلق (ا) قرآن اور حدیث (ب) عربی ادب اور (ج) سیرت سے تھا۔

انگریزی کے کورس کا مقصد یہ تھا کہ زبان کو اس معیار تک پڑھایا جائے کہ (ا) طلبا درست اور بامحاورہ انگریزی لکھ سکیں، اور (ب) اس قسم کے مضامین لکھنے میں ماہر ہو جائیں جس قسم کے مضامین صحافت میں درکار ہوتے ہیں، نیز (ج) ترجمے کا کام خاصی سہولت سے کر سکیں۔

جامعہ سینیئر میں تاریخ اور سیاسیات کا کورس تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ تین حصے یہ تھے : (ا) المامون کے دور تک کی تاریخ اسلام، (ب) 1207 تک کی تاریخ ہند، اور (ج) سیاسیات۔

سندی جامعہ میں بھی تاریخ اور سیاسیات کا کورس تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ تین

حصے یہ تھے: (ا) دورِ عثمانیہ سے دورِ جدید تک کی اسلامی تاریخ اور سیاست، (ب) یورپین قوموں کی آمد سے دورِ جدید تک ہندوستان کی تاریخ اور سیاست، اور (ج) 1815 سے دورِ جدید تک کی یورپی تاریخ اور سیاست۔

جامعہ سینیئر اور سندی جامعہ دونوں میں تاریخ کا مطالعہ اس انداز سے کرایا جاتا تا کہ طلبا میں تاریخ کے ان دھاروں اور مخالف دھاروں کی فہم پیدا ہو جائے جنھوں نے دنیا اور ہندوستان کو موجودہ شکل دینے میں مدد کی۔ ماضی کے مطالعے کا مقصد حال کو سمجھنا تھا۔ حالانکہ زور سیاسی تاریخ پر ہی تھا لیکن تاریخ کے ثقافتی اور سماجی اور کسی حد تک اقتصادی پہلوؤں پر بھی نظر رکھی جاتی تھی۔ تاریخ کو اس طرح پڑھانے کے لیے محمد مجیب اور ایم جے کلاٹ جیسے اساتذہ نہایت موزوں تھے۔

معاشیات کے کورس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ دوسرے اداروں میں پڑھائے جانے کے انداز سے جامعہ کا انداز مختلف تھا۔ سارے ہی کورسوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ مشاہدہ کر کے، تجربہ کر کے اور ماضی اور حال کے واقعات کا مقابلہ کر کے تدریس مضامین کو دلچسپ اور مفید مطلب بنایا جاتا تھا[39]۔ یہ دعویٰ بڑی حد تک اس لئے معتبر لگتا ہے کہ معاشیات ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد عاقل جیسے ماہرین علم پڑھاتے تھے۔

اردو زبان کی ساخت اور نشوونما کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لیے کسی نہ کسی حد تک ہندی اور فارسی کے مطالعے کو نہایت ضروری سمجھا گیا تھا۔ بہرصورت کالج کی سطح پر اردو پڑھانے کا خاص مقصد یہ تھا کہ طلبا اردو ادب کو متوازن انداز میں سراہ سکیں۔ طلبا کو مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کی تربیت دی جاتی تھی۔

1946 میں استادوں کے مدرسے (ٹیچرس کالج) میں تین کورس تھے۔ ایک کورس ایک سال مدت کا تھا، دوسرا دو سال مدت کا تھا، تیسرا علم تازہ کرنے والا ((ریفریشر) کورس تھا جو ملازم پیشہ اساتذہ (اِن سروس ٹیچرس) کے لیے تھا۔ یہ تیسرا کورس تین سے چار ماہ تک کی مدت کا تھا۔

ایک سال مدت والا کورس ڈپلوما آف بیسک ٹریننگ کہلاتا تھا۔اس کے تین حصے تھے۔

نظری (تھیوری)، عملی (پریکٹیکل)، اور حرفہ (کرافٹ)

نظری حصے میں مندرجہ ذیل مضامین شامل تھے:

(1) اصولِ تعلیم اور نفسیات

(2) عام طریقہ ہائے تدریس اور معاشرتی نظام

(3) زبان اور سماجی علوم کی تدریس

(4) ریاضی اور عام سائنس کی تدریس

(5) آرٹ اور ڈرائنگ

عملی حصہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا تھا:

(1) مشقی اسباق کی روئیداد (ریکارڈ)

(2) تنقیدی سبق

(3) امدادی سامان اور حرفے کی روئیداد

(4) اسباق کی تنقید جس کی روئیداد مشاہدے کی نوٹ بک میں درج کی جاتی تھی

(5) کسی مجوزہ جماعت کے نصاب کا اکائی منصوبہ

(6) امتحان کا سبق

کالج میں مندرجہ ذیل حرفوں کی تربیت کا انتظام تھا:

(1) کتائی اور بنائی

(2) گتے کا کام اور لکڑی کا کام

(3) باغبانی

(4) کاغذ سازی

یہ دوسالہ کورس مستقبل کے ان اساتذہ کے لیے شروع کیا گیا تھا جو ان اسکولوں میں استاد بننے کے خواہش مند تھے جو سارجنٹ پلان کے تحت سارے ہندوستان میں کھلنے والے تھے۔ حکومتِ ہندوستان نے جامعہ میں ٹریننگ دلوانے کے لیے ساٹھ اساتذہ بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ کورس بھی ڈپلوما آف بیسک ٹریننگ کورس کے خطوط پر تیار کیا گیا تھا۔

استادوں کا مدرسہ ان ملازم پیشہ اساتذہ کے لیے اکثر اوقات ریفریشر کورسوں کا انتظام کرتا تھا جو نظری اور عملی تعلیم کے نئے رجحانات سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ یہ ایک طرح کے مختصر کورس ہوتے تھے جن کا مقصد ملازم پیشہ اساتذہ کی مجموعی کارکردگی کو بہتر بنانا ہوتا تھا[40]۔

1923 کے دستور العمل والے کئی پیشہ ورانہ کورسوں کو ختم کر دینے اور 1946 میں حرفے شامل کرنے کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک سبب تو بنیادی تعلیم کی اسکیم شروع کرنا تھا جس میں حرفے کا تصور پیشہ ورانہ تربیت سے مختلف تھا۔ حرفہ علوم سے رابطے کا مرکز تھا یعنی سارے مضامین اس سے ربط کر کے پڑھائے جاتے تھے۔ وہ محض حرفہ نہیں 'تعلیمی حرفہ' تھا جو بچوں کی سماجی، جذباتی اور حرکی نشوونما میں مدد کر سکتا تھا۔ غالباً ان دونوں اسباب ہی کی بنا پر 1946 میں برقی ملمع سازی، رنگ سازی، تالے بنانا، طباعت، ٹائپ رائٹنگ اور مختصر نویسی جیسے پیشوں کی تربیت ختم کر دی گئی تھی۔

پھر بھی 1946 میں پیشوں سے متعلق ایک اسکول کا منصوبہ بنایا گیا تھا جس میں مندرجہ ذیل پیشوں کی تربیت کے لیے دو سال کا پیک کورس تجویز کیا گیا تھا۔

1۔ انجینئرنگ

1۔ فٹنگ یا عمارت میں اوپری تنصیبات لگانا، بینچ ورک یا میز پر کام کرنا جیسے لکڑی کا کام

2۔ لیتھ ورک یعنی خراد کا کام

3۔ الیکٹروپلیٹنگ یا برقی ملمع سازی، اور پالشنگ یا رنگ سازی

4۔فاؤنڈری یا ڈھلائی کا کام

5۔کاسٹنگ یا سانچے میں ڈھالنا

6۔ویلڈنگ یا جوڑ اور ٹانکا لگانا

7۔شیٹ میٹل ورک یا دھات کی چادروں کا کام جن سے چیزیں بنائی جائیں۔

2۔لکڑی کا کام

(1) لکڑی کا سامان بنانا اور ان کا خاکہ بنانا

(2) نمونے تیار کرنا۔

3۔آرٹ

(1) تصاویر اور کارٹون، آرائشی خاکے

(2) بلاک ڈائی بنانا یعنی لکڑی کے چھاپوں کے رنگ تیار کرنا، ربر اور دھات کی مہریں بنانا

4۔تجارتی کاروبار

(1) بک کیپنگ یعنی تجارتی سودوں کی باقاعدہ حساب نویسی

(2) کمرشل پریکٹس یا تجارت و کاروبار سے متعلق طریقہ

(3) شاپ کیپنگ یا دوکان سجانا اور اس میں آمد و خرچ کا حساب رکھنا

5۔بجلی کا کام

(1) وائرنگ یا تار لگانا

(2) بجلی کے سامان کی مرمت

6۔نقشے بنانا

7۔کیمیائی صنعتیں

حالانکہ پیشہ ورانہ تربیت کا کوئی اسکول قائم نہیں کیا جاسکا، لیکن ڈھلائی کا کام، دھات

کا کام، لکڑی کا کام، کیمیائی چیزوں کی تیاری وغیرہ جیسے پیشوں کی تربیت شروع کرنے کی وجہ سے موجودہ ثانوی اسکول متنوع مقاصد (ملٹی پرپز) کا اسکول بن گیا، اور اس شکل میں خاصی مدت تک چلتا رہا۔ اسکول کے نصاب میں ان پیشوں کی تربیت شامل ہوتی رہی جو وقتاً فوقتاً جامعہ میں شروع کیے گئے تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خصوصیات

حکیم اجمل خاں نے 7 دسمبر 1921 کو جامعہ کے پہلے خطبۂ تقسیم اسناد میں کہا تھا کہ 'ہم نے اپنے نظامِ تعلیم میں قرآن شریف کو مرکزی مقام دیا ہے۔ حالانکہ ہم نے جدید علوم کو اپنے نظام میں ایک مقام ضرور دیا ہے، لیکن ان کو غلام بنایا ہے اور قرآن اور اسلام کو ان کا آقا'[41]۔

مولانا محمد علی نے اپنے مضمون 'نیشنل مسلم ایجوکیشن' میں لکھا تھا: '.....قرآن شریف کے گہرے علم کو لازمی بنیاد تصور کیا گیا تھا۔ اس لیے (جامعہ میں تعلیم کی) ہر سطح پر اللہ کے لفظ کو اچھی طرح سمجھنے کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں'[42]۔

جب ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ ہوئے تو علوم اسلامی کو جاری ہوئے مدت ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے خاص طور سے ان کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن انھوں نے اسلامی روایات، اسلامی ثقافت وغیرہ کی باتیں ضرور کیں۔ 1929 میں انھوں نے کہا 'جامعہ کا نصب العین اور مقصد جاننے کے لیے یہی جاننا کافی ہے کہ وہ اس وقت قائم ہوا جب اسلام اور مسلمان دونوں سخت پریشانی میں مبتلا تھے اور جب دو فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر مادرِ وطن کو آزاد کرانے کی کوشش کی تھی۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو جامعہ اسلامیہ بھی ہے اور ملیہ (نیشنل) بھی۔ ایک طرف وہ اسلامی روایات کو اور اسلامی تعلیم کو نئی توانائی بخشے گا، اور دوسری طرف ملک کی آزادی کی اور متحدہ قومیت کا تصور پیدا کرنے کی کوشش کرے گا'[43]۔

ڈاکٹر عابد حسین نے، جن کا میلانِ طبع فلسفیانہ تھا، مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین پر فکر

کرتے ہوئے 1928 میں لکھا تھا کہ 'بچے سچے مسلمان تب ہی بن سکتے ہیں جب وہ اسلامی تہذیب کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہوں، ان پہلوؤں کے باہمی تعلق اور ان کی حدود سے واقف ہوں، اور اسلام کے درست ضابطۂ عمل پر گامزن رہیں'[44]۔ ان کے خیال میں جسمانی اور ذہنی نشو ونما پر اگر قابو رکھا جائے تو ایک متوازن شخصیت بنتی ہے۔ نشو ونما کا یہ قابو یافتہ عمل اس عمل کے مترادف ہوتا ہے جو کسی شخص کو ایک اچھا مسلمان بننے میں مدد کرتا ہے۔

محمد مجیب نے اپنے مضمون 'ذاکر صاحب اور تعمیرِ جامعہ' میں لکھا تھا کہ 'جامعہ کے قیام کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ علم کو مذہب کا رنگ دیا جائے' اور اس مقصد کے حصول کی ایک ضروری شرط مذہب کا واضح تصور اور ایسے تعلیم داں حضرات کا موجود ہونا تھا جو علم کو مذہب کا رنگ دے سکیں اور اس کے برعکس بھی کر سکیں'[45]۔

بہر حال، جامعہ ملیہ کے ہر بانی نے اسلامی تعلیمات پر، خصوصاً قرآن شریف کے مطالعے پر زور دیا۔ انھوں نے اسلام کے مطالعے ہی پر نہیں اس پر عمل کرنے پر بھی زور دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ کا ایک اوسط طالب علم اسلامی علم کا خوب مطالعہ کرتا تھا، اسلامی معمول پر کاربند رہتا تھا اور بغیر کسی جھگڑے فساد کے اسلام پر عمل پیرا رہتا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نہایت مذہبی مگر اس کی نمائش سے گریزاں، اوکھلا کے خاموش اور پُر امن مقام پر اسلامی بھائی چارے اور اسلامی مساوات پر مبنی ایک ایسی جامعہ برادری بنانے میں کامیاب ہو گئے جہاں شیخ الجامعہ اور ایک معمولی چپراسی دونوں کو صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

جامعہ کی دوسری خصوصیت اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا تھا۔ حکیم اجمل خاں نے 1929 میں کہا تھا 'چونکہ ہماری تعلیم کا مقصد ملازموں اور ماتحتوں کا ایک نیا طبقہ بنانا نہیں بلکہ علم میں دلچسپی پیدا کرنا اور انسانی برتاؤ پر اس کا اثر ڈالنا ہے، اس لیے ہم نے غیر ملکی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے غیر فطری طریقۂ تدریس کو یک قلم موقوف کر دیا ہے..... اور طے کیا ہے کہ اپنے نظامِ تعلیم کے

واسطے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنائیں'[46]۔

مولانا محمد علی نے 9 جنوری 1928 کے ہمدرد کے کالم میں ذریعۂ تعلیم کے مسئلے پر ذرا تفصیل سے بحث کی ہے، اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مادری زبان چونکہ طالب علم کے لیے آسان ترین زبان ہوتی ہے اس لیے اس کے واسطے مادری زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم ہونا چاہیے، مولانا محمد علی نے مزید لکھا ہے کہ 'انھوں نے (یعنی حکیم اجمل خاں نے) صرف مادری زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم بنایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ کی کُل مدتِ تعلیم میں دو سال کی تخفیف ہوگئی، اور طالب علموں کی معلومات اس کم مدت میں بھی دوسرے اداروں کے طلبا سے زیادہ ہے'[47]۔

بنیادی تعلیم کی اسکیم میں، جس سے ڈاکٹر ذاکر حسین وارد ھا میں ہونے والی اکتوبر 1937 کی پہلی کانفرنس سے ہی مختلف حیثیتوں میں وابستہ رہے تھے، مادری زبان کے تعلیمی فوائد کو مان لیا گیا تھا، اور اس لیے اسے بنیادی اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم بنالیا گیا تھا۔

حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر ذاکر حسین سب ہی مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں تھے۔ جامعہ میں طلبا اور اساتذہ کی بھاری اکثریت کی مادری زبان اردو تھی۔ اس لیے ادارے میں تعلیم کا ذریعہ اردو بن گئی۔ اردو سے ایک اور فائدہ ہوا کہ وہ ہندوستان کے اسلامی ادب کی بھی زبان تھی جس کا مطالعہ جامعہ کے اولین مقاصد میں شامل تھا۔

گاندھی جی اور ان کے افرادِ خاندان سے بانیانِ جامعہ کی طویل وابستگی اور مادری زبان کے اصول کو تسلیم کرنے کی وجہ سے جامعہ میں اردو، ہندی تنازعہ کا کوئی سبب نہ رہ گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے طلبا کو کسی قدر ہندی پڑھنا اس لیے لازمی تھا تاکہ وہ اس بات کو سمجھ سکیں کہ اردو کی نشو ونما میں ہندی کا کیا حصہ ہے۔ نہ کوئی تنازعہ اردو اور انگریزی کے درمیان تھا، ہر چند کہ جامعہ اپنی نشو ونما کے کم از کم ابتدائی مرحلوں میں برطانیہ مخالف رہا تھا۔ انگریزی زبان ہمیشہ ثانوی اسکول اور جامعہ کالج کے نصابات میں شامل رہی۔ باوجود اس کے کہ اردو جامعہ میں ذریعۂ تعلیم

تھی ہندی یا انگریزی کے خلاف کبھی کوئی تعصب نہیں برتا گیا، اور ان طلبا کو مطمئن رکھنے کی کوشش کی گئی جو ان زبانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اردو کا مسئلہ یہ تھا کہ کتابیں میسر نہ تھیں۔ یاد رکھیے کہ علی گڑھ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی حکمتِ عملی اسی بنا پر ناکام ہوئی تھی۔ لیکن جب جامعہ اس منزل پر پہنچا تو عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد نے اردو میں بہت مواد تیار کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ خود جامعہ نے 1922 میں اپنا دارالاشاعت، مکتبہ جامعہ اور شعبۂ اشاعت، اردو اکیڈمی قائم کر لیے تھے۔ 1927 کے بعد سے اکیڈمی کی حکمتِ عملی یہ رہی تھی کہ خواندہ اور تعلیم یافتہ بالغوں کے واسطے مطبوعات تیار کرنے کے علاوہ بچوں کا ادب بھی شائع کیا جائے۔ اردو کی اچھی کتابوں کی عدم موجودگی کی تلافی کمرۂ جماعت میں دیے جانے والے لیکچروں کو اچھی طرح تیار کر کے اور توسیعی خطبات کا انتظام کر کے کی گئی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، محمد مجیب، پروفیسر عاقل اور لائق اساتذہ کی ایک بڑی تعداد جنھوں نے خود کو جامعہ کے لیے وقف کر دیا تھا اسکولوں اور کالجوں میں کلاسیں لیتے اور لیکچر دیتے تھے، اور اس طرح اردو میں اچھی کتابوں کی غیر موجودگی کی تلافی کرتے تھے۔

جامعہ کے اساتذہ، خصوصاً ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور محمد مجیب اچھے مترجم تھے۔ انھوں نے انگریزی کتابوں کا ترجمہ سہل اور آسانی سے پڑھی جانے والی اور سمجھ میں آنے والی اردو میں کیا۔ اکیلے ڈاکٹر عابد حسین نے کوئی بیس کتابوں کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے مولوی عبدالحق کے ساتھ مل کر اسٹینڈرڈ انگلش، اردو ڈکشنری بھی تیار کی[48]۔

محمد مجیب جنھوں نے ہندوستان میں ہمیشہ انگریزی ذریعۂ تعلیم والے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی، اور پھر آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کی سند حاصل کی تھی، اردو کے ایک صاحبِ اسلوب مصنف بن گئے تھے۔ ان کی تصنیفات کا دائرۂ موضوعات بہت وسیع ہے۔ ان کی تصانیف، تراجم اور لیکچروں سے ان کے طلبا کو یقیناً بھرپور تعلیمی تجربات ہوئے ہوں گے۔

توسیعی خطبات کا باقاعدگی سے تقریباً ہر سال انتظام کیا جاتا تھا۔ ان کا انتظام کبھی انجمنِ اتحاد کرتی، جو 1922 میں قائم کی جانے والی طلبا کی انجمن تھی، اور کبھی ان کا انتظام اردو اکیڈمی کرتی تھی۔ 1929 میں انجمن نے فلکیات پر ڈاکٹر ضیاالدین کے توسیعی خطبے کا انتظام کیا تھا۔ اگلے سال انجمن نے مولانا شوکت علی، مسز سروجنی نائیڈو، پروفیسر گرمانس، پروفیسر ٹھکر (شانتی نکیتن) اور مولانا آزاد سبحانی کے توسیعی خطبات کا انتظام کیا تھا[50]۔ 1931-32 کے تعلیمی سال میں انجمنِ اتحاد نے ہاشم امیر علی، کرنل جے ارڈ اور مولانا سبحانی کے توسیعی خطبات کا انتظام کیا تھا۔ اردو اکیڈمی نے 1932-33 کے تعلیمی سال میں 'قدیم اور جدید ترکی' کے موضوع پر ایک ممتاز ترک قائد حسین رؤف بے کے توسیعی خطبات کا انتظام کیا تھا۔ ان میں سے دو خطبے اس وقت دیے گئے جب ڈاکٹر سر محمد اقبال صدرِ مجلس تھے[51]۔ اس کے اگلے سال ترک دانشور بہجت وہبی نے 'اسلام کا عروج و زوال' کے موضوع پر چار توسیعی خطبات دیے تھے[52]۔ 1934-35 کے تعلیمی سال میں خالدہ ادیب خانم نے آٹھ توسیعی خطبات دیے جو 'ترکی میں مشرق اور مغرب کی کشمکش' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے[53]۔

مندرجہ بالا معلومات سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ ممتاز شخصیات اور علمی درسگاہوں کے ارکان اکثر جامعہ آتے تھے اور مختلف موضوعات پر خطبات دیتے تھے۔ یہ خطبات اور مقامی اساتذہ کے کمرۂ جماعت سے باہر ہونے والے مباحثے اور لیکچروں نے پرانے جامعہ کے طلبا کے ذہنی افق کو یقیناً وسعت دی ہوگی، اور مختلف عنوانات پر درکار معیاری کتابوں کی عدم موجودگی کی بڑی حد تک تلافی کی ہوگی۔

جامعہ کی تیسری خصوصیت پیشہ وارانہ تربیت کا پروگرام تھا۔ جامعہ چونکہ عدم تعاون کی تحریک کے جلو میں قائم ہوا تھا، اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ اس سے فارغ شدہ طلبا ملازمتوں کے لئے حکومت کی طرف دیکھیں۔ مزید برآں، عدم تعاون ایک عوامی تحریک تھی، اور یہ ادارہ جس کا

وجود اس تحریک کا مرہونِ منت تھا فطری طور پر معاشرے کے ہر طبقے کی خدمت کرنا چاہتا تھا اور محض علی گڑھ کا خوش حال طبقہ ہی اس کے پیش نظر نہ تھا۔

خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کے حوالے سے سرکاری ملازمتوں کے خلاف دلیل دیتے ہوئے مولانا محمد علی نے ہمدرد میں لکھا تھا کہ سات کروڑ مسلمانوں کی آبادی میں تحریک کے دوران حکومت نے سات لاکھ کو بھی ملازمتیں نہیں دی تھیں۔ اسی مضمون میں ایک جگہ یہ لکھا تھا کہ سارے طلبا کے لیے ایک حرفے کی تربیت اس لیے لازمی کر دی گئی ہے کہ تا کہ وہ حرام خوری (یعنی سرکاری ملازمت) کرنے کے لئے مجبور نہ ہو جائیں، اور ایک ایسا ہنر ان کے پاس ہو جس کے ذریعے وہ اپنی روزی کما سکیں [54]۔

حکیم اجمل خاں نے بھی کسی گزری ہوئی تاریخ کو ان پیشوں کے حق میں دلیلیں دی تھیں جن کو عزتِ نفس اور قومی وقار کو مجروح کیے بغیر اپنایا جا سکتا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے حرفوں کی ضرورت پر زور دیا تھا [55]۔

اسی لئے جامعہ میں حرفہ سیکھنا پیشہ وارانہ تربیت کے مترادف تھا جس کا مقصد تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد روزی کمانے کے لیے بھی کام آ سکتا ہے، یا کسی ایسے وقت کام آ سکتا ہے جب روزی کمانے کے سارے دروازے بند ہو گئے ہوں۔

حرفے کو اس وقت قوم کی منظوری بھی حاصل ہو گئی جب گاندھی جی نے پہلے ہریجن کے صفحات میں اور پھر 22 اکتوبر 1937 کو وارھا میں ہونے والی کانفرنس میں دیہی علاقوں کے لیے مفت، لازمی اور خود کفیل تعلیم کی اسکیم پیش کی، جو اپنی آخری شکل میں بنیادی قومی تعلیم (بیسک نیشنل ایجوکیشن) کہلائی [56]۔ اس اسکیم میں حرفہ ربط کا ایک اہم مرکز تھا جس سے مربوط کر کے ریاضی، سماجی علوم، مادری زبان وغیرہ مضامین کی تعلیم دی جا سکتی تھی۔

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے وارد ھا کانفرنس میں شرکت کی، اور پھر بنیادی تعلیم کی

نیشنل کمیٹی کے صدر مقرر کیے گئے۔ یہ کمیٹی بنیادی تعلیم کی ایک اسکیم کی تفصیلات طے کرنے اور نصابِ تعلیم تیار کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ کمیٹی کی سفارشات یہ تھیں: (ا) سات سال تک مفت اور لازمی تعلیم، (ب) مادری زبان ذریعۂ تعلیم (ج) ربط کے تین مرکزی یعنی حرفہ، سماجی ماحول اور قدرتی ماحول ہوں، اور ساری تعلیم ان سے مربوط کر کے دی جائے۔

جامعہ میں استادوں کا مدرسہ (ٹیچرس کالج) 1938 میں قائم کیا گیا تھا تا کہ بیسک اسکولوں کے لیے استاد تیار کیے جائیں۔ حرفے جن کو اب تعلیمی حرفے کہا جانے لگا تھا، اب محض اس مقصد سے نہیں سکھائے جاتے تھے کہ تعلیم مکمل ہونے پر پیشے کے طور پر اختیار کر لیے جائیں، بلکہ زیادہ تر اپنی تعلیمی اور سماجی اہمیت کی بنا پر سکھائے جاتے تھے۔ بہر حال، جامعہ نے مختلف پیشوں کی تربیت دینے کی اپنی حکمتِ عملی جاری رکھی۔ ان میں سے کچھ یہ تھے: ڈھلائی کا کام، دھات کا کام، دودھ کے جانور پالنا، کیمیاوی چیزوں کی تیاری۔ کیمیاوی چیزوں کی تیاری تو بس نام کی تھی کیونکہ جامعہ کی کیمیائی صنعت کی پیداوار میں مچھر بچاؤ تیل، مچھر بچاؤ کریم، ویسلین پومیڈ، مفید منجن، جام اور جیلی، مارملیڈ، شربت اور جامعہ سیاہی شامل تھے۔

جامعہ کی ایک اور خصوصیت اس کا یہ اقرار تھا کہ وہ محض درمیانی طبقے کے خوش حال لوگوں ہی کی نہیں بلکہ ہر طبقے کی خدمت کرے گا۔ جامعہ نے 1926 میں ایک مدرسۂ شبینہ (نائٹ اسکول) قائم کیا تھا تا کہ قرول باغ کے گردونواح میں رہنے والے لوگوں میں تعلیمِ بالغاں کا کام کیا جائے۔ اس مدرسے نے کچھ دن کام کیا پھر بند ہو گیا۔ پھر 1938 میں شفیق الرحمٰن قدوائی نے ایک اور شعبہ قائم کیا جس کا نام تعلیم و ترقی رکھا گیا۔

تعلیم و ترقی نے قرول باغ میں ایک مرکز 'تعلیمی مرکز' کے نام سے قائم کیا جس نے اس علاقے کا مکمل جائزہ لیا جہاں خواندگی کا کام کرنا تھا۔ اس نے علاقے کے لوگوں کے لیے ایک دیواری رسالہ اور ایک چلتا پھرتا کتب خانہ شروع کیا۔

اس نے ایسا مواد تیار کیا جس کا تعلق (ا) نصاب، (ب) پوسٹروں وغیرہ، اور (ج) تعلیم کے اس میدان میں کام کرنے والے کارکنان کے لیے رہنما خطوط سے تعلق رکھتا تھا۔ کوئی تین سو رسالے ایسی زبان میں تیار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا جسے خواندہ لوگ سمجھ سکیں۔ مفروضہ یہ تھا کہ تعلیم و ترقی نے عوام میں خواندگی پھیلانے کے لیے جو نصاب تیار کیا تھا وہ تین سو رسالے اس پورے نصاب کا احاطہ کر لیں گے۔

پوسٹر وغیرہ آسان زبان میں لکھے گئے تھے، اور تصویروں اور چارٹوں کے ذریعے انھیں سمجھایا گیا تھا۔ انھیں مسجدوں، اسکولوں اور کتب خانوں میں لگانے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ شعبۂ تعلیم و ترقی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کارکنان درست ہدایتوں کے بغیر خواندگی کے کام کو باقاعدگی سے نہیں کر سکتے۔ خواندگی پر اتنا مواد تیار کرنے کا یہی سبب تھا۔

رسالوں اور پوسٹروں نے بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا تھا جن کا تعلق مذہب، ادب، تاریخ، جغرافیہ، شہریت، سیاسیات، اقتصادیات، صحت و صفائی، مختلف لوگوں کی سوانح عمری، سائنس کی ترقی، پیشوں کی معلومات، ریاضی، تجارت و کاروبار اور زراعت سے تھا[57]۔

تعلیم و ترقی کی سرگرمیاں صرف ان ہی تک محدود نہیں تھیں جو ناخواندہ تھے۔ شعبہ ان بچوں کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھتا تھا جو مالی وسائل کی کمی کی بنا پر جامعہ جیسے اقامتی اسکول کے اخراجات کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے دن میں پڑھنے والے طلبا کے لیے تعلیمی مرکز قرول باغ میں ایک اسکول شروع کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ طبقے کی تعلیمی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے لیکچروں کا انتظام کیا گیا تھا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم و ترقی کی سرگرمیوں کی بنا پر جامعہ اوکھلا سے ملحق گاؤں سے میل جول قائم کرنے میں اس درجہ کامیاب ہوا کہ 1947 کے تاریک دنوں میں وہ بڑی حد تک فسادات سے محفوظ رہا[58]۔

ایک اور خصوصیت اس کے اساتذہ اور کارکنوں کا جامعہ سے دلی تعلق اور جامعہ کے لئے قربانیاں دینے کا جذبہ تھا۔ جامعہ کے ابتدائی برسوں میں جب ادارے کی مالی حالت غیر اطمینان بخش تھی 1928 ہی میں جامعہ کے گیارہ کارکنوں نے عہد کیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک سو پچاس روپے ماہانہ پر جامعہ کی بیس سال خدمت کریں گے۔ 1928 کے بعد والے برسوں میں بھی بہتوں نے یہ عہد کیا، لیکن جنھوں نے باقاعدہ طور پر یہ عہد نہیں کیا انھوں نے بھی اپنی تنخواہوں میں کمی کرنے کی حامی بھر لی۔

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی تنخواہ 1948 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بننے سے پہلے تک، اسی (80) روپے تھی۔ محمد مجیب خود بھی اسی کشتی کے سوار تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے قریبی ساتھی تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی مالی دشواریاں بہت قریب سے دیکھی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ 'ان کا ہاتھ ہمیشہ تنگ رہتا تھا۔ لیکن کسی کو اس کی خبر نہ ہوتی، جامعہ کے خزانچی تک کو نہیں' کیونکہ ڈاکٹر ذاکر حسین کبھی اپنی تنخواہ نہ مانگتے۔ جب ضرورت پڑتی، تو وہ جا کر عاجزی سے بیوی کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور کہتے مجھے روپیہ چاہیے۔ وہ اس وقت کی مزاجی کیفیت کے تحت یا تو احتجاج کرتیں یا پھر ایک لمبا سانس لیتیں، اور قرض لینے کے لیے ملازم لڑکے کو یا تو سبا بیٹے کے پاس بھیج دیتیں جس کی دوکان قریب ہی تھی، یا پھر مقو خاں ٹھیکیدار کی بیوی کے پاس بھیج دیتیں جو نزدیک کے مکان میں رہتے تھے۔ بیگم ذاکر حسین کو اپنے دادا کی زمین کی پیداوار سے دس روپے ماہانہ ملا کرتے تھے۔ گھر چلانے کے لیے انھیں بس اسی رقم پر بھروسہ تھا'[59]۔

مورخ کوثر کے مصنف کے الفاظ میں جامعہ کے استادوں کی قربانی کا مقابلہ ہندو یونیورسٹی بنارس، ڈی اے وی کالج لاہور اور سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی پونا میں بڑی تعداد میں کی جانے والی قربانیوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق اس طرح کی قربانیاں مسلمانوں میں نایاب تھیں[60]۔

قربانی اور دلی تعلق کا یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر کارکنانِ جامعہ اس وقت بھی اسے چلاتے رہے جب ٹرسٹیوں نے، ترکی مجلس ملی کے 3 مارچ 1924 کے اس فیصلے کے بعد کہ خلیفہ کو معزول کر دیا جائے اور خلافت کا عہدہ ہی ختم کر دیا جائے، بددل ہو کر اس ادارے کو بند کر دینے کا فیصلہ کر دیا تھا جو اس اعلیٰ عہدے (خلافت) کو بحال کروانے کی تحریک کے جلو میں قائم کیا گیا تھا۔

جامعہ کے کارکنان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ادارے کے بڑھتے ہوئے اخراجات تنخواہیں کم کرنے سے بچی ہوئی رقم سے پورے نہیں کیے جا سکتے۔ اس لیے انھوں نے لوگوں سے عطیات اور رقومات دینے کی درخواست کی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے محض دولت مند لوگوں، تنظیموں، نوابوں اور راجاؤں ہی پر تکیہ نہیں کیا بلکہ عام لوگوں کو بھی رجوع کیا۔ 1932 میں ایک شعبہ ہمدردانِ جامعہ کے نام سے اس غرض سے قائم کیا گیا کہ لوگوں کو جامعہ کی سرگرمیوں نیز اس کے عزائم اور منصوبوں سے باخبر رکھا جائے۔ عطیہ کنندگان کے نام اور ان کے عطیوں کی رقومات کی فہرستیں اس شعبے کے جریدے 'ہمدردِ جامعہ' میں برابر شائع کی جاتیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں جو کُل رقم وصول ہوئی وہ 1938 میں 23032 روپے سے بڑھ کر 1946 میں 285306 روپے ہو گئی[61] اور عطیہ کنندگان کی تعداد بڑھ کر آٹھ ہزار ہو گئی[62]۔

حالانکہ جامعہ کا وجود ایک بڑی اہم سیاسی تحریک کا مرہونِ منت تھا لیکن اس نے اپنی نشوونما کی نہایت ابتدائی منزل میں ہی یہ طے کر لیا تھا کہ ملک کی سیاست سے دور رہے گا۔ ادارے پر خلافت کمیٹی کی گرفت 1923 سے ہی ڈھیلی ہونے لگی تھی، اور جب وہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا تو بالکل ہی ختم ہو گئی۔ جامعہ کے کارکنان اپنی ساری قوت ادارے کی ترقی پر خرچ کرتے تھے۔ جن افراد نے ملک کی سیاست میں حصہ لیا انھوں نے ایسا اپنی ذاتی حیثیت میں کیا۔ حافظ فیاض احمد، دیوداس گاندھی، شفیق الرحمٰن قدوائی، حسین حسنان، کنک چندر ڈیکا اور کرشنا نائر نے،

جن میں سے شروع کے تین استاد اور آخر کے تین طالب علم تھے، 1929 میں شہری نافرمانی کی تحریک میں گرفتاریاں دیں۔

لیکن جامعہ نے بحیثیت ادارہ اس زمانے کے تقریباً سارے ممتاز سیاسی قائدین سے تعلق ضرور رکھا۔ 1928 میں جامعہ کے یوم تاسیس کی تقریبات میں جو قائدین شریک ہوئے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت موتی لعل نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے، سری نواس آئینگر، سیلیا مرتی، این، سی کیلکر، مولانا ظفر الملک، مسز اینی بیسنٹ، مسٹر آصف علی نے شرکت کی۔ مولانا محمد علی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری تو بہر حال موجود ہی تھے [63]۔ 1946 میں سلور جوبلی کے موقع پر ایک خاص میٹنگ میں شرکت کرنے آصف علی، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، راج گوپال اچاریہ، محمد علی جناح اور مس فاطمہ جناح آئے تھے [64]۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مہاتما گاندھی، جن کا شمار بانیانِ جامعہ میں کیا جاتا ہے، کئی بار جامعہ آئے تھے۔ ان کے بیٹے دیوداس گاندھی کچھ عرصے جامعہ کے اساتذہ میں شامل رہے تھے۔ گاندھی جی نے اپنے پوتے رسک لال کو جامعہ میں پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔ رسک لال بیمار ہوئے اور فوت ہو گئے۔ جب گاندھی جی اپنے پوتے کی المناک وفات پر جامعہ آئے تو انھوں نے دوسرے بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ: 'یہ بچے میرے غم کا مداوا کریں گے' [65]۔

جامعہ نے اپنے نام — نیشنل مسلم یونیورسٹی — کی ہمیشہ لاج رکھی، اس زمانے میں بھی جب کانگریس اور مسلم لیگ دست و گریباں تھے، اور نیشنل مسلم کی ضد بن گیا تھا۔ جامعہ آج کی طرح تب بھی نیشنل تھی اور مسلم بھی۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مقالات سرسید، جلد، 22 مجلس ترقی ادب، لاہور، 1962، صفحات 82 تا 86

2. G.F.I. Graham, The life and work of Sir Saiyyid Ahmad Khan, Oxford University Press, London, 1974, p. 132

3۔ سید عابد حسین، سید کا خواب اور اس کی تعبیر، علی گڑھ تحریک، 1925 صفحہ 12

4۔ محمد اکرام اللہ خاں، وقار حیات، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ 1925، صفحہ 590

5۔ ایضاً صفحہ 591

6۔ ایضاً، صفحہ 592

7۔ مولانا محمود حسن، خطبہ صدارت، 29 اکتوبر 1920، صفحہ 6

8۔ ایضاً، صفحہ 7

9۔ ایضاً، صفحہ 9

10۔ حکیم اجمل خاں، خطبہ صدارت، مطبع ملیہ، علی گڑھ، 1921 صفحہ 7

11. Afzal Iqbal, Select Writings and Speeches of Maulana Mohammad Ali, Sheikh Mohammad Ashraf, Lahore,

1944, pp. 413-414.

12۔ حکیم اجمل خاں، متذکرہ بالا خطبہ، صفحہ 16

13۔ ایضاً صفحہ 18

14۔ مولانا محمد علی، جامعہ ملیہ ہے کیا، لطیفی پریس، دہلی، صفحہ 22

15. Afzal Iqbal, op. Cit; 427-428

16۔ سعید انصاری، جامعہ ملیہ اسلامیہ بانیانِ جامعہ کی نظر میں، گولڈن جوبلی پبلیکیشن، 1970، صفحہ 16، محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، 1972، صفحہ 46 بھی دیکھئے۔

17۔ عبدالغفار مدھولی، جامعہ کی کہانی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، 1965، صفحہ 105

18۔ ایضاً صفحات 182 تا 183

19۔ سعید انصاری، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 34 تا 35

20. Shan Mohammad, The Indian Muslims, Val VII, Meenakshi Prakashan, Meerut, 1983, p. 7

21. Ibid, p. 52

22۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہونے کا احوال مندرجہ ذیل کتابوں سے لیا گیا ہے:

(ا) Shan Mohammad, op. cit; pp. 62-66، (ب) عبد الغفار مدھولی، متذکرہ بالا کتاب صفحات 19 تا 30، (ج) سید محمد ٹونکی، بانیانِ جامعہ، جامعہ پرنٹنگ پریس، دہلی، صفحات 25 تا 49

23. M. Mujeeb, Dr. Zakir Husain, National Book Trust, India, New Delhi, 1972, p. 42

24۔مولانا محمد علی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 3

25۔جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔مختصر تاریخ اور دستور العمل، مصنف نے خود چھپوائی، دہلی، صفحہ 48۔

26۔عبدالغفار مدھولی، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 123 تا 124

27۔دیوداس گاندھی: پیدائش 22 مئی، 1900، گروکل اور شانتی نکیتن، بول پور میں تعلیم پائی، اپنا کاروبار زندگی بحیثیت صحافی شروع کیا، کئی دفعہ جیل گئے، دو دفعہ انڈین اینڈ ایسٹرن نیوز پیپر سوسائٹی کے صدر رہے اور آل انڈیا نیوز پیپرز کانفرنس کے تین دفعہ صدر رہے، دی ہندوستان ٹائمز کے مینجنگ ڈائرکٹر۔

T.V. Rama Rao (Ed.), India at a Glance, Orient Longman, Bombay, 1954, p. 1709

28۔عبدالغفار مدھولی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 134

29۔ایضاً صفحات 244، 246، 248

30۔ایضاً صفحات 259 تا 260

31۔ایضاً صفحہ 372، یہ بھی دیکھئے M. Mujeeb, op. cit; p. 76

32. Afzal Iqbal, op. cit; pp. 417- 418

33. Ibid, p. 419

34. Ibid, p. 420

35. Ibid, pp. 427-428

36۔لفظ اسکول غالباً علم کے مخصوص دائرے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

37۔ یہ معلومات مندرجہ ذیل سے حاصل کی گئی ہے: (۱) دستور العمل جامعہ ملیہ

اسلامیہ 24-1923، ملی پریس، علی گڑھ، صفحات 6 تا 12، اور (ب) دستور العمل جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ، 25-1924

38۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1916، صفحہ 233

39۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 99

40۔ یہ معلومات جامعہ ملیہ اسلامیہ، متذکرہ بالا کتاب کے صفحات 66 تا 109 سے حاصل کی گئی ہے۔

41۔ حکیم اجمل خاں، متذکرہ بالا خطبہ، صفحہ 15

42. Afzal Iqbal, op. cit; p. 416

43۔ عبدالغفار مدھولی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 126

44۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ، مطبع جامعہ ملیہ، دہلی، 1928، صفحہ 13

45۔ محمد مجیب، ذاکر صاحب اور تعمیر جامعہ، نذر ذاکر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1968، صفحہ 6

46۔ حکیم اجمل خاں، متذکرہ بالا خطبہ، صفحات 16 تا 17

47۔ مولانا محمد علی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 22

48۔ جمیل احمد قریشی، ڈاکٹر سید عابد حسین بحیثیت گرانی، نذر عابد، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1947ء، صفحات 5 تا 9

49۔ عبدالغفار مدھولی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 136

50۔ ایضاً، صفحہ 146

51۔ ایضاً صفحہ 170

52۔ایضاً صفحہ 180

53۔ایضاً صفحہ 197

54۔مولانا محمد علی، متذکرہ بالا کتاب، صفحات 44، 47

55۔حکیم اجمل خاں، متذکرہ بالا خطبہ، صفحہ 18

56. M. Mujeeb, op. cit; p. 101

57۔جامعہ ملیہ اسلامیہ، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 113

58۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو اس وقت اوکھلا میں رہ رہے تھے۔ان میں سے کچھ تعلیم و ترقی میں بھی کام کرتے تھے۔ان کا کہنا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب گاؤں پر حملے کی افواہیں ہر طرف پھیل گئیں۔اس وقت گاندھی جی کے کہنے پر حفاظت کے لئے فوج لگادی گئی۔

59. M.Mujeeb, op. cit; p. 50

60۔شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، 1975ء، صفحہ 157

61۔جامعہ ملیہ اسلامیہ، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 157

62۔ایضاً صفحہ 48

63۔عبدالغفار مدھولی، متذکرہ بالا کتاب، صفحہ 115

64۔ایضاً صفحہ 458

65۔ایضاً، صفحہ 118

نتائج

نتائج

اٹھارھویں صدی کے ہندوستان میں برطانوی ایک بڑی سیاسی قوت بن کر ابھرے۔ ہندوستانیوں کے لیے نئے نئے ثقافتی اور تعلیمی مسائل پیدا ہو گئے۔ بنگال کے ہندوؤں نے نئی تعلیم کو جلد ہی اپنا لیا۔ اہلِ برطانیہ نے مسلمان حکمرانوں کو شکست دے کر حکومت ان سے چھینی تھی اس لیے مسلمان ہر اس چیز سے جس کا تعلق برطانیہ سے تھا نفرت کرنے لگے تھے۔ جدید تعلیم بھی انہی قابلِ نفرت چیزوں میں شامل تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس کو اپنانے کی کوشش نہ کی۔ ادھر اہلِ برطانیہ نے ہر اس چیز کو دبانے کی کوشش کی جس کی مدد سے مسلمان دوبارہ سیاسی قوت بن سکتے تھے۔

تعلیم ذہنی رویوں میں تبدیلی کا بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندوستانیوں کے ذہن بدلنے کے لیے نئے حکمرانوں نے تعلیم کا سہارا لیا۔ یہی نہیں بلکہ نئی تعلیم کے ذریعے وہ اپنی انتظامیہ کے لیے عہدیداروں کی کھیپ بھی تیار کرنا چاہتے تھے۔ ہندوؤں کو ترک حکمرانوں سے پہلے ہی سابقہ پڑ چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے انگریزی تعلیم کو اپنانے اور انگریزی تہذیب کو رد نہ

کرنے میں دیر نہ لگائی۔ لیکن مسلمانوں کو انگریزوں کی نیت اور ان کے ارادوں پر شبہ تھا اس لئے وہ انگریزی تعلیم اور تہذیب سے دور ہی رہے۔

1857 کے تباہ کن واقعات کے بعد انگریزی راج قائم ہو گیا اور بچی کھچی مغل حکومت بھی ختم ہو گئی۔ 1857 کے خونی واقعات کے سب سے بڑے شکار شمالی ہندوستان کے مسلمان تھے۔ انھیں اپنی بے چارگی کا شدید احساس ہوا۔ بدلتے ہوئے وقت کی چاپ اب انھیں صاف سنائی دینے لگی۔ نئی تعلیم اور نئی تہذیب کے مسائل کو ٹالنا اب ممکن نہ تھا۔ ان مسائل کے حل کے طور پر دو ادارے قائم ہوئے، ایک دیوبند اور دوسرا علی گڑھ۔ دیوبند مسلم دورِ حکومت کی تعلیمی روایتوں کو جاری رکھنے کے لیے قائم ہوا، اور علی گڑھ برطانوی نئی تعلیم پھیلانے کے لیے قائم ہوا۔

دیوبند روایتی تعلیم کا حامی تھا، نہ اس کے نصاب میں کوئی تبدیلی ہوئی نہ طریقۂ تدریس میں۔ دیوبند کا نصاب وہی پرانا درسِ نظامی رہا، اور پڑھانے کا طریقہ بھی وہی درسی کتابوں کو پڑھنا اور انھیں سمجھانا رہا۔ دیوبند رفتہ رفتہ ایک معروف مذہبی درسگاہ بن گیا۔ اس پوری مدت میں اس نے کبھی بھی مغربی تعلیم سے کسی طرح کی مفاہمت نہیں کی۔ برطانیہ مخالف جذبات اس کی بنیاد میں موجود تھے۔ آزادیٔ ہند تک یہ جذبات جوں کے توں قائم رہے۔ تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں بھی انہی جذبات کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ انگریزی حامی اشخاص کا بھی قائل نہ رہا۔ تحریکِ پاکستان کے قائدوں میں اسے ان ہی لوگوں کی اکثریت نظر آئی۔

دارالعلوم دیوبند بدیہی طور پر تعلیم اور تہذیب کے میدان میں اسلامی روایات کو جاری و ساری رکھنے کی کوشش کا اظہار تھا۔ اسی دینی درسگاہ میں پڑھنے والی مسلمان نسلوں کے لیے اسلامی تعلیمات اعلیٰ ترین تعلیمات تھیں۔ یہاں روایات کا زور اس قدر تھا کہ انگریزی زبان اور ایسے مضامین جن پر مغربی تعلیم کی مہر لگ گئی ہو دارالعلوم کے حصار میں کبھی داخل نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ فلسفہ اور منطق کا معمولی علم بھی اہلِ دیوبند کو اس لیے ناپسند تھا کہ وہ عقائدِ اسلامی کے بارے میں شبہات

پیدا کر سکتا تھا۔

دارالعلوم کے بانیوں اور اساتذہ کی نسلوں نے بڑی یکسوئی اور اور انہماک کے ساتھ اس کی خدمت کی، ورنہ عوام کے چندوں سے چلنے والا یہ ادارہ قائم نہ رہ پاتا۔ اس کے زیادہ تر عطیہ کنندگان، اساتذہ اور طلبا معمولی زمینداروں، کاشتکاروں اور اوسط درجے کے تاجروں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی یہ امید نہ باندھی کہ تعلیم ختم کر کے انھیں ملازمت مل جائے گی۔ اس لیے مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواہ اچھا کیا یا برا کیا، لیکن دیوبند نے مغربی تعلیم اور تہذیب کو سرے سے قبول ہی نہ کیا، اور بڑے معاندانہ حالات میں روایتی اسلامی علوم کا چراغ جلائے رکھا۔

مغربی تعلیم اور تہذیب کے تئیں علی گڑھ کا رویہ بڑا مثبت تھا۔ انگلستان کے سفر سے سرسید کو یقین ہو گیا تھا کہ تہذیب و تمدن کا وہ اعلیٰ معیار جس پر برطانوی پہنچ گئے ہیں، مغربی تعلیم کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں نے مذہب کے بارے میں غلط تصورات قائم کر رکھے تھے اور ضعیف العتقیدگی کے شکار تھے اور دوسری طرف سیاسی قوت بھی ان سے چھن گئی تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر وہ سماجی، تعلیمی اور اقتصادی طور پر پچھڑ گئے تھے۔

مسلمانوں کے مسائل سمجھ کر انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ایک سہ رخی تدبیر اختیار کی۔ اسلام کے بارے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں، خصوصاً انگلستان کے عیسائیوں کے غلط مذہبی تصورات دور کرنے کے لیے ادبی تحریروں کا سہارا لیا گیا، مسلمانوں اور برطانوی حکمرانوں کے درمیان ملکی سیاست کے بارے میں جو شک اور شبہات پائے جاتے تھے ان کو دور کرنے کی عملی کوششیں کی گئیں، علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا گیا جہاں کیمبرج یونیورسٹی کے خطوط پر مغربی تعلیم دی گئی۔ اس لیے علی گڑھ تحریک محض ایک کالج کا قیام نہ تھی بلکہ مغربی تعلیم اور تہذیب کے چیلنج کا ایک نہایت معقول جوابی عمل تھا جو گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ایک تاریخ ساز تحریک کی شکل اختیار کرتا گیا۔

علی گڑھ کالج یقیناً اس تحریک کا سب سے زیادہ جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ کالج رہائشی تھا۔ یہاں طلبا کے کردار اور برتاؤ پر اختیار رکھا جاسکتا تھا۔ یہاں طلبا کی نئی نسلیں ایک ایسے تعلیمی اور سماجی ماحول میں پروان چڑھ سکتی تھیں جو ایک انحطاط پذیر معاشرے کے برے اثرات سے دور تھا۔ کالج کے انگریز پرنسپلوں اور استادوں نے طلبا کو مغربی تعلیم اور تہذیب کی خوبیوں سے روشناس کرایا۔

انگریز پرنسپلوں کے زمانے میں طلبا نے کچھ ایسی روایتیں قائم کیں جو بظاہر کیمبرج کے انداز کی تھیں لیکن جن کا مزاج جاگیر دارانہ تھا۔ علی گڑھ کالج کا تعلیمی معیار کلکتہ اور الہ آباد یونیورسٹیوں کے تعلیمی معیار سے کبھی اونچا نہ ہوا۔ علی گڑھ کالج کا الحاق دونوں یونیورسٹیوں سے رہا ۔ تعلیمی معیار کی اس کمی کی تلافی علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبا کے مطابق کھیلوں کی کامیابی اور ادارے کے اندر کی بہتر سماجی زندگی سے ہوجاتی تھی۔

علی گڑھ ایک الحاقی کالج تھا۔ اسے نصاب میں تبدیلی کا اختیار نہ تھا۔ دینیات کے کورس وہ البتہ بنا سکتا تھا۔ حدیث، فقہ، عقائد، اور کلام کی کتابوں کے خلاصے پڑھائے جاتے تھے۔ دینیات کے مضامین کی پڑھائی پر وقت کم دیا جاتا تھا۔ لیکن نماز کی پابندی اور قرآن کی تلاوت پر زور دینے کی وجہ سے ان لوگوں کو اعتراض کا موقع نہ مل پاتا جو سمجھتے تھے کہ مغربی تعلیم طلبا کو اسلام سے دور اور عیسائیت سے قریب کر دیتی ہے۔

سرسید کے زمانے کا علی گڑھ برطانیہ موافق حکمتِ عملی پر گامزن رہا۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ کہیں 1857 جیسا زمانہ پھر نہ پلٹ آئے۔ بلکہ اس حکمتِ عملی کی بنا پر امن کا وہ ماحول بنا ہوا تھا جو اس اعلیٰ مقصد یعنی اونچے درجے کی تہذیب کے حصول میں معاون ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ حکمتِ عملی اس دور میں بھی قائم رہی جب حالات کا تقاضہ تھا کہ اسے بدل دیا جائے، یعنی خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے دوران۔

مغربی تعلیم کو مسلمانوں میں مقبول بنانے میں علی گڑھ یقیناً ایک انتہائی سنجیدہ کوشش تھی، اور وہ کامیاب بھی ہوئی۔ زمیندار طبقہ خاص طور سے علی گڑھ کی طرف مائل ہوا۔ یہ طبقۂ اشراف تھا۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانی طبقے کے مرکز میں یہی طبقہ تھا۔

تاریخ وار ترتیب کے اعتبار سے تیسرا ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں قائم ہوا۔ ماضی کے مسلم معاشرے میں علما کو جس عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا علما کی اسی عزت اور احترام کو بحال کرنے کے لیے یہ ادارہ قائم ہوا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے دو ذرائع تھے۔ ایک تو نیا نصاب تیار کرنا جو نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکے، اور دوسرا مختلف مسلکوں پر عمل کرنے والے علما کے درمیان جو اختلاف تھے انھیں دور کرنا۔ بعض اوقات تو ان اختلافات کی معقول وجوہات بھی نہ ہوتی تھی۔

متعدد نصابات تیار کیے گئے لیکن ندوۃ العلما کا نصاب تعلیم درس نظامی سے زیادہ دور نہ ہو سکا۔ خصوصاً دینیات کے دائرۂ علم میں۔ معقولات کا حصہ خاصہ کم کر دیا گیا، اور عربی ادب اور اسلامی تاریخ پر زور بڑھا دیا گیا۔ انگریزی اور کبھی کبھی سنسکرت نصاب میں شامل کر دی گئی۔

ندوہ میں عربی بول چال پر خوب زور دیا گیا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ طلبا عربی کتابیں زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں، اور دوسرا یہ کہ دنیا میں دس کروڑ عربی بولنے والوں میں وہ شامل ہو جائیں۔ اس سے ندوہ میں تعلیمی معیار اونچا ہوا۔ یہ حکمتِ عملی اس لیے بھی اہم تھی کیونکہ دنیا کی سیاست میں عرب ایک اقتصادی قوت بن کر ابھر رہے تھے۔

مذہبی علوم کا بہتر ادراک اور انگریزی کا معمولی علم ایک نیا علمِ کلام نہ تیار کر سکے، کیونکہ مذہبی تحقیقات کے لیے ایک زیادہ آزاد تعلیمی ماحول درکار تھا۔ لیکن طلبا کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ عیسائی علما اسلام پر جو اعتراضات کرتے تھے انھیں سمجھ سکیں اور ان کے جواب دے سکیں۔

ندوہ شیعہ اور سنی علما کے اختلافات، دیوبندی اور بریلوی علما کے اختلافات، مقلد اور

غیر مقلد علما وغیرہ کے اختلافات کو اگرچہ دور نہ کر سکا۔ لیکن علما کو مفاہمت کے فائدوں سے اور مخالفت کے نقصانات سے اس نے آگاہ ضرور کر دیا۔

ندوہ لکھنؤ میں قائم ہوا۔ یہ اردو تہذیب کا مرکز تھا۔ شہری مزاج کی نرمی نے نصاب، طریقۂ تدریس اور ان چیزوں میں تبدیلیاں قبول کر لیں جن پر مذہب نے سختی سے کوئی روک نہیں لگائی تھی۔ رویوں کی یہ لچک اس طبقۂ اشخاص کا خاصہ تھی جنھوں نے ندوہ قائم کیا اور چلایا۔ یہ طبقۂ اشخاص اس طبقۂ اشخاص سے زیادہ مختلف نہیں تھا جنھوں نے علی گڑھ کالج قائم کیا اور اسے چلایا۔

ندوہ اس وقت قائم کیا گیا تھا جب علما کو مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی زندگی کی وہ باتیں نظر آنے لگی تھیں جن پر اعتراضات کیے جاتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ اسلام کی مدافعت تو کی ہی جائے، معترضین پر بھی اعتراضات کیے جائیں۔ ندوہ، دیوبند کی طرح قلعہ بند ہو کر نہ بیٹھا کہ مغربی تعلیم و تہذیب اس میں نہ در آئیں، بلکہ اس نے افہام و تفہیم کے دائرے کو وسیع کر کے مخالفینِ اسلام اور مغربی تہذیب کے داعیوں کو اس کے اندر شامل کر لیا۔ ندوہ کے پاس مغرب کی تعلیم اور تہذیب کو روکنے کے لئے ایک حل بھی تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آیا تو علی گڑھ کی کوششوں کی وجہ سے مغربی تعلیم و تہذیب مسلمانوں میں قدم جما چکی تھی، لیکن قومی بیداری کی بنا پر مغربی تہذیب کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ اس ادارے نے مغربی تعلیم اور اسلامی تعلیم میں حقیقی مصالحت کی کوشش کی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریکِ خلافت کے ساتھ پیدا ہوا تھا، لیکن وہ صرف اسی تحریک کی اولاد نہ تھا۔ اس کا بیج تحریک سے کہیں پہلے پڑ چکا تھا۔ اس کے خط و خال اس ادارے سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھے جس کا تصور سرسید، سید محمود اور بعد میں وقار الملک نے کیا تھا۔

چونکہ جامعہ نے مغربی تعلیم کو اس لیے قبول نہیں کیا کہ تعلیم سے فارغ ہو کر اس کے طلبا سرکاری ملازمتیں کریں گے، اس لیے اس کے تمام تعلیمی فیصلے تعلیم کے اچھے اصولوں کے مطابق

کیے گئے۔ مادری زبان اس کا ذریعۂ تعلیم بنی، ہاتھ کے کام کو نیچی حیثیت سے اوپر اٹھا کر تعلیمی حرفہ کا رتبہ دیا۔ جامعہ کا آزاد ماحول تجربے اور جدت کے لیے موزوں تھا، چنانچہ تعلیم کے میدان میں یہاں کچھ اچھے تجربات کیے گئے۔

قیامِ دہلی اور قومی وابستگی کے سبب جامعہ تنگ نظری سے بالاتر رہا، اور ایک ایسا اسلامی ادارہ بنا جس میں اسلام اور ہندوستانی انداز کا سیکولرازم ساتھ ساتھ پنپ سکتے تھے۔ اس نے دیوبند اور علی گڑھ سے وہ ساری باتیں لے لیں جو اس کے قومی اور اسلامی ڈھانچے میں سما سکتی تھیں۔

ندوہ اور جامعہ دونوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم میں اصلاح کو اپنا نصب العین بنایا۔ ندوہ ان حساس علما کے ہاتھوں وجود میں آیا جو علی گڑھ کے فارغ شدہ طلبا میں مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات سے غیر مطمئن بلکہ خائف تھے۔ مغربی تہذیب کے یہ اثرات مسلم سماج کے اونچے درمیانی طبقے میں سرایت کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک ایسا تعلیمی پروگرام وضع کرنے میں پہل کی جو اسلام اور اسلامی تہذیب کا دفاع کر سکے۔ ان دنوں عیسائی مشن کی سرگرمیاں بڑے جارحانہ انداز میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ ندوہ مختلف الخیال علما کو بھی یکجا کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ مل کر مسلمانوں میں مغربی تعلیم و تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات پر روک لگا سکیں۔

جامعہ اس احساس کے سائے میں وجود میں آیا کہ علی گڑھ، جس پر انگریز پرنسپلوں اور بااثر برطانیہ موافق مسلمانوں کا غلبہ تھا، مسلمانوں کی اس نئی نسل کی امنگوں اور حوصلوں کو پورا نہ کر پا رہا تھا جو یورپین خصوصاً برطانوی سامراج کے عزائم اور منصوبوں پر سخت مضطرب اور بے چین تھی۔ یورپین قوموں کے یہ منصوبے سارے ایشیا اور افریقہ، خصوصاً ان دونوں براعظموں کے مسلمان ملکوں کے بارے میں تھے۔ وہ لوگ جنھیں یہ احساس شدت سے تھا وہ جدید تعلیم کے خلاف نہیں تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کی تعلیم پر انھیں پورا پورا اختیار ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو

ذریعۂ تعلیم ہو اور نصاب تعلیم جو مسلمان طلبا کے لیے وضع کیا جائے اس کا بنیادی حصہ اسلامی تہذیب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جدید مضامین کو روایتی مضامین کے مقابلے میں زیادہ وقت دیا گیا۔

ندوہ اور جامعہ تعلیم کے میدان میں ایسے تجربات کی نمائندگی کرتے ہیں جن کے مقاصد نہایت واضح اور محدود تھے۔ کہا جاتا ہے یہ ادارے جدید اور قدیم میں مفاہمت چاہتے تھے۔ لیکن یہ مفاہمت ایک ایسے روایتی معاشرے میں کیوں کر ہو سکتی تھی جو نہ اپنی ساخت بدلنا چاہتا تھا نہ اپنا مذہبی اور سماجی رویہ۔ مسلم سماج نے قدامت پسند رہنا منظور کیا جس کی جڑیں روایتی قدروں میں تھیں۔ اس نے اصولِ حرکت سے بھی انکار کر دیا اللہ نے قرآن میں جس کی اجازت دی ہے۔

مزید یہ کہ یہ دونوں ادارے بنیادی طور پر 'جدیدیت' کے خلاف ایک طرح کے مدافعانہ جوابی عمل تھے۔ اس بنیادی کمزوری کی بنا پر یہ ادارے مسلمانوں کے تعلیمی اور تہذیبی مسائل کی بس پیوندکاری کر سکے اور یہ ان ہی پرانے دھاروں یعنی روایتی دیوبند اور جدید علی گڑھ کی طرف مڑ گئے۔ آج ندوہ اتنا ہی روایتی ہے جیسا کہ قدامت پسند دیوبند اور جامعہ نہایت تیزی کے ساتھ ایک جدید یونیورسٹی بنتا جا رہا ہے۔

کتابیات

کتابیات

1۔ الندوہ، جلد پنجم، نمبر شمار 7، اگست 1908

2۔ الندوہ، جلد پنجم، نمبر شمار 11، دسمبر 1908

3۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، مطبع مفید عام، آگرہ، 1903

4۔ ابوالحسن علی ندوی، حیاتِ عبدالحیؒ، ندوۃ المصنفین، دہلی، 1970

5۔ ابوالحسن علی ندوی، خطبۂ استقبالیہ، دفترِ اجلاس ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1975

6۔ ابوالحسن علی ندوی، ندوۃ العلماء ایک دبستانِ فکر ایک رہنما تعلیمی تحریک، دفترِ اجلاس ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1975

8۔ اسماعیل پانی پتی (تدوین)، مکتوباتِ سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1959

9۔ اسماعیل پانی پتی (تدوین)، مقالاتِ سرسید، (22) (26) (60)، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1962

10۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، مقصد اور موقف، مصنف، نئی دہلی

11۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ مختصر تاریخ اور دستور العمل، مصنف، دہلی، 1946

12۔ حافظ فیاض احمد، جامعہ کی چند کھوپڑیاں، سنگم کتاب گھر، دہلی، 1960

13۔ حبیب اللہ خاں، حیاتِ آفتاب، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، 1947

14۔ حسین احمد مدنی، نقش حیات، جلد دوم، محبوب پرنٹنگ پریس، دیوبند، 1954

15۔ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، ندوۃ العلماء، اس عہدِ انقلاب میں اس کا کام اور پیغام، دفترِ اجلاس ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1975

16۔ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، استاذ العلماء، معارف پریس، اعظم گڑھ

17۔ حکیم اجمل خاں، خطبۂ صدارت 7 دسمبر 1921، مطبع ملیہ، علی گڑھ، 1921

18۔ ذاکر حسین، تعلیمی خطبات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1961

19۔ رپورٹ ندوۃ العلماء حصہ اول، 1894، انتظار پریس، کانپور

20۔ رپورٹ ندوۃ العلماء، 1895، المطبع لکھنو

21۔ رپورٹ ندوۃ العلماء، 1910، مطبع احمدی، علی گڑھ

22۔ رپورٹ ندوۃ العلماء 1915، شاہی پریس، لکھنؤ

23۔ سعید انصاری، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ بانیانِ جامعہ کی نظر میں، یونین پرنٹنگ پریس، دہلی، 1970

24۔ سید عابد حسین، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 1964

25۔ سید عابد حسین، مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ، مطبع جامعہ ملیہ، دہلی، 1928

26۔ سید عابد حسین (تدوین)، اسلام اور عصرِ جدید، اپریل 1975، جلد ہفتم، نمبر شمار 2، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

27۔سید احمد خاں، آثار الصنادید، سینٹرل بک ڈپو، دہلی، 1965

28۔سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، مطبع علیمی، دہلی، 1945

29۔سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1943

30۔سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول و دوئم، ادارۂ اہتمام دارالعلوم، دیوبند، 1977

31۔سید محمد ٹونکی، بانی جامعہ، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

32۔شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1975

33۔شاہ عبدالعزیز، فتویٰ عزیزی، مطبع مجتبائی، دہلی، 1311ھ

34۔ضیاالحسن فاروقی (تدوین)، جامعہ جشن زریں نمبر، نومبر 1970

35۔ضیاالحسن فاروقی (تدوین)، نگارشات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 1974

36۔عبدالحق، مرحوم دلّی کالج، انجمن ترقی اردو

37۔عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ہندوستانی اکاڈیمی، الہ آباد، 1936

38۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، دسمبر 1889

39۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، فروری 1895

40۔عبدالغفار مدھولی، جامعہ کی کہانی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1965

41۔عبدالسلام قدوائی، ندوۃ العلما کا تخیل اور پیغام، دفترِ اجلاس ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1975

42۔عبدالسلام قدوائی، ندوۃ العلماء کے پچاسی سال، دفترِ اجلاس ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1975

43۔محمد الحسنی، پیامِ ندوۃ العلماء، دفترِ اجلاس ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1975

44۔محمد الحسنی، روداد چمن، مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1976

45۔محمد الحسنی، سیرت مولانا محمد علی مونگھیری، مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1964

46۔محمد عاقل (تدوین)، جامعہ جوبلی نمبر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، 1946

47۔مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، جلد دوم، دفترِ دار العلوم دیوبند، 1953

48۔محمود حسن، خطبۂ صدارت 29 اکتوبر 1920، لطیفی پریس، دہلی، 1920

49۔مولوی محمد حسین، باالتنظیم لنظام التعلم وتعلیم، مطبع انوار احمد، الہ آباد، 1312ھ

50۔مولوی محمد ابراہیم، مضامینِ اربعہ، المطبع لکھنؤ

51۔محمد آئی، جلیس اور شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء، دفترِ نظامت ندوۃ العلماء، لکھنؤ، 1983

52۔ملک فضل الدین کاکے زئی (تدوین)، تہذیب الاخلاق، جلد اول و دوئم، قومی بازار، لاہور

53۔مجلس نذیر ذاکر، نذیر ذاکر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1968

54۔مالک رام (تدوین)، نذیر عابد، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1974

55۔محمد علی، جامعہ ملیہ کیا ہے؟ لطیفی پریس لمیٹڈ، نئی دہلی

56۔محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد دوئم وسوئم، الجمعیت بک ڈپو، 1957

57۔مسعود علی ندوی (تدوین)، مقالاتِ شبلی، جلد ہفتم وہشتم، معارف اعظم گڑھ، 1938

58۔محمد طیب، دار العلوم دیوبند، دفتر اہتمام دار العلوم دیوبند، 1965

59۔ندوۃ العلماء، ضوابط ندوۃ العلماء، اسلامی پریس، کانپور

60۔ندوۃ العلماء، نصاب تعلیم ابتدائی، متوسط، ثانوی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، نظامی پریس، لکھنؤ، 1980

61۔نسیم قریشی (تدوین)، علی گڑھ تحریک: آغاز تا امروز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1960ء

62. Aligarh Muslim University, Syllabus and Course of Studies 1940, The Author, Aligarh, 1940.
63. Andrews C.F., Zaka Ullah of Delhi, W. Heffer and Sons Ltd., Cambridge, 1929.
64. Arnold T.W., The Preaching of Islam, Shaikh Mohammad Ashraf, Lahore, 1961.
65. Aziz Ahmad, Islamic Modernism in India and Pakistan 1857-1964, Oxford University Press, London, 1967.
66. Banerjee A.C., The Constitutional History of India, Vol.I (1600-1858), The Macmillan Co., Delhi, 1977.
67. Beck, Theodore, Essays on Indian Topics, Pioneer Press, Allahabad, 1888.
68. Bhatnagar S.K., History of the M.A.O. College, Asia Publishing House, Bombay, 1969.
69. Farooqi Z.H., The Deoband School and the Demand for Pakistan, Asia Publishing House, Bombay, 1963.
70. Gopal S., British Policy in India, (1858-1905), Cambridge University Press, Cambridge, 1965.
71. Graham G.F.I., The Life and Work of Sir Saiyyad Ahmad Khan, Oxford University Press, Karachi, 1974.
72. Hali, Altaf Husain, Hayat-e-Javed, Idarah-e-Adabiyat-e-Dilli, Delhi, 1979.
73. Haq, Mushir U. Muslim Politics in Modern India (1857-1947), Meenakshi Prakashan, Meerut, 1970.

74. Hardy P., The Muslim of British India, Cambridge University Press, Cambridge, 1972.
75. Hunter W.W., Indian Musalmans, The Premier Book House, Lahore, 1964.
76. Husain, Syed Abid, The Destiny of India's Muslims, Asia Publishing House, Bombay, 1965.
77. Iqbal, Afzal, Select Writings and Speeches of Maulana Mohammad Ali, Shaikh Mohammad Ashraf, Lahore, 1944.
78. Jain M.S., The Aligarh Movement, Shri Ram Mehra & Co., Agra, 1965.
79. Jamia Millia Islamia, The Memorandum of Association and The Rules, The Author, New Delhi, 1976.
80. Jamia Millia Islamia, Prospectus 1923-24, The Author, Aligarh 1923.
81. Jamia Millia Islamia, Prospectus 1924-25, The Author, Aligarh 1924.
82. Joshi P.C., Rebellion 1857, People's Publishing House, New Delhi, 1957.
83. Khan, Saiyyid Ahmad, Structures upon the Present Education System in India, N.P., 1869.
84. Lelyveld D., Aligarh's First Generation, Oxford University Press, New Delhi, 1978.
85. Mahmood, Syed, A History of English Education in India, M.A.O. College, Aligarh, 1965.
86. M.A.O. College, An Account of the Ceremony of Laying the Foundation Stone of the M.A.O. College Aligarh, The Pioneer Press, Allahabad, 1877.
87. M.A.O. College, Calendar 1911-12, The Indian Press, Allahabad, 1911.
88. Metcalf, Barbara Daly, Islamic Revival in British India: Deoband 1860-1900. Princeton University Press,

Princeton, New Jersey, 1982.

89. Metcalf, Thomas R., The Aftermath of Revolt, Princeton University, Princeton, 1965.
90. Mohammad Ali, My Life : A Fragment, Shaikh Mohammad Ashraf, Lahore, 1942.
91. Mohammad Ali, The Proposed Mahomedan University, Caxton Printing Works, Bombay, 1904.
92. Morison, Theodore, The History of the M.A.O. College, The Pioneer Press, Allahabad, 1903.
93. Mujeeb M., The Indian Muslims, George Allen and Unwin, London, 1967.
94. Mujeeb M., Dr. Zakir Husain, National Book Trust of India, New Delhi, 1972.
95. Nehru, Jawahar Lal, The Discovery of India, Meridian Books Ltd., London, 1960.
96. Nizami K.A., Saiyyid Ahmad Khan, Publications Division, New Delhi, 1966.
97. Nurullah S. and Naik J.P., A Students History of Education in India, Macmillan & Co., Bombay, 1956.
98. O' Donnell, C.J., The Causes of Present Discontent in India, T. Fisher Unwin, London, 1908.
99. Rama Rao T.V. (ed.), India at a Glance, Orient Longman, Bombay, 1954.
100. Ram Gopal, Indian Muslims: A Political History, Asia Publishing House, Bombay, 1959.
101. Reid C.L., Inner History of East India Company, Abhishesh Publications, Chandigarh, 1979.
102. Robinson, Francis, Separatism among Indian Muslims, Cambridge University Press, Cambridge, 1974.
103. Sen S.P. (ed.), Dictionary of National Biography, Institute of Historical Studies, Calcutta, 1974.
104. Shan Mohammad (ed.), The Aligarh Movement, Basic

Documents Vol. III, Meenakshi Prakashan, Meerut, 1978.
105. Shan Mohammad (ed.), The Indian Muslims, Basic Documents Vol. VII, Meenakshi Prakashan, Meerut, 1983.
106. Shan Mohammad, Sir Saiyyid Ahmad Khan, Meenakshi Prakashan, Meerut. 1969.
107. Smith W.C., Modern Islam in India, Princeton University Press, Surrye, 1957.
108. Sufi G.M.D., Al-Minhaj, Shaikh Mohammad Ashraf, Lahore, 1941.
109. Tara Chand, History of Freedom Movement in India, Vol.II, Publication Division, New Delhi, 1967.
110. Thompson E. and Garrat G.T., Rise and Fulfilment of British Rule in India, Central Book Depot, Allahabad, 1962.
111. Tonki S.M., Aligarh and Jamia Fight for National Education System, People's Publishing House, New Delhi, 1983.
112. Von Grunebaum, Modern Islam: The Search for Cultural Identity, University of California Press, Berkeley and Los Angeles, 1962.
113. Zakaria, Rafiq, The Rise of Muslims in Indian Politics, Somaya Publications, Bombay, 1971.

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تعلیم کے مقاصد اور وسائل

مصنف: تھیوڈر برامِلڈ

ہارپر اینڈ برادرس

صفحات:243

قیمت :-/84روپے

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: غلام السیدین

مترجم : ایم۔ابوبکر

صفحات:307

قیمت :-/96روپے

تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری

مصنف: عبدالغنی مَدہوش

صفحات:192

قیمت :-/67روپے

زمان ومکان

مصنف: وزیرحسن عابدی

صفحات:192

قیمت :-/15روپے

اسکولی تعلیم کے لیے قومی نصاب کا ڈھانچہ

مترجم : معین اعجاز

صفحات:194

قیمت :-/133روپے

جواہر پارہ ادراک

مصنف: شنکر اچاریہ

مترجم : کرشن کمار یاٹھک

صفحات:90

قیمت :-/8روپے

₹ 74/-

ISBN 978-81-7587-747-4

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025